دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اکتوبر تا دسمبر 2018ء / محرم الحرام تا ربیع الاول 1440ھ جلد نمبر 10 شمارہ نمبر 4 رجسٹرڈ نمبر S-370

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

عصرِ حاضر میں ولی اللّٰہی فکر کی ضرورت اور اہمیت

''آج ہماری جو فکری، سیاسی اور معاشی حالت ہو چکی ہے، اس کا تجزیہ کریں تو ہمارے ہاں فکری انتشار ہے، سیاسی عدمِ استحکام ہے، معاشی و اقتصادی تباہی و بربادی ہے۔ سماجی حالات کی خرابی ہے۔ علم و فکر کی حالت یہ ہے کہ آج ہم اہلِ علم فرقوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کو کافر بنانے، سوسائٹی کو انتشار میں مبتلا کرنے، جاہلانہ حرکتیں کرنے، ایک دوسرے کی گردن مارنے اور مذہب فروشی کے کام کر رہے ہیں۔ جب کہ دنیا کی ظالم قومیں اس بات کا بہ بانگِ دُہل اعلان کر رہی ہیں کہ: ''ہم نے مذہب کو چھوڑ کر ترقی کی ہے۔ مذہب جہاں بھی ہوگا، وہ انتشار کا باعث بنے گا۔ تباہی و بربادی لائے گا۔'' سرمایہ داری نظام والے کہتے ہیں کہ ہم نے مذہب کو چھوڑ کر ترقی کی ہے۔ سوشلسٹ بھی یہی کہتے ہیں۔ اب آپ بتلایئے کہ ایسے ماحول میں جہاں خود ہمارے اپنے عمل و کردار نے اور غیروں کی یلغار نے ہمارے دین اور مذہب کو تنقید کا نشانہ بنایا ہوا ہے، وہاں دین اور مذہب کی وہ علمی جامع تعلیم اور مکمل فکر و فلسفہ جو سوسائٹی میں وحدت پیدا کرنے، سوسائٹی کی سیاسی، معاشی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک بنیادی کردار ادا کرنے والا جامع فکر ہے، ہم متلاشیانِ علم کو تو ضرور اسے سیکھنا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ عوام اہلِ علم کی علمی باتیں نہیں سمجھ سکتے، لیکن ہم اہلِ علم و فکر کی تو یہ فلسفہ و فکر ضرورت ہے۔ اگر ہم اپنی دین کے ساتھ وابستگی کا اعلان کرتے ہیں، دین کے نام پر اس ملک کے بنانے کے دعوے کیے گئے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دین کا ایک مربوط علمی بیانیہ کیا ہے؟ اس کا ایک مکمل علمی فکر کیا ہے؟ آج تو ہمارے ملک میں یہ مخمصہ پیدا کر دیا گیا کہ دین کا اصل بیانیہ کیا ہے؟ اور پھر اپنے خود ساختہ بیانیے کے نام پر انتشار پیدا کرنا، انفرادی رائے قائم کرنا اور ایک دوسرے کے خلاف فتوے بازی کا ماحول بنانا سوسائٹی کی بہت بڑی تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکر؛ دین کا ایک صحیح، جامع اور مکمل بیانیہ واضح کرتا ہے۔ یہ نہ صرف بیانیہ ہے، بلکہ اس کا علمی تجزیہ، فکر و فلسفہ، عملی نظام اور ایک مربوط ڈھانچہ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اس جامع فکر و عمل کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!''

(حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف، ص 45)

www.rahimia.org

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اکتوبر تا دسمبر 2018ء / محرم الحرام تا ربیع الاوّل 1440ھ | جلد نمبر 10 شمارہ نمبر 4 | رجسٹرڈ نمبر 370-S

بانی حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوری قدس سرہٗ السعید

مجلس ادارت

سرپرست	**مدیرِ اعلیٰ**
پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن	حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
صدر	**مدیر**
مفتی عبدالمتین نعمانی	مولانا محمد عباس شاد

مجلس مشاورت

☆ مفتی محمد اشرف عاطف	لاہور	☆ ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی	سکھر	☆ پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر	اسلام آباد
☆ مفتی عبدالقدیر	چشتیاں	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناصر	جھنگ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر	اسلام آباد
☆ مفتی محمد مختار حسن	نوشہرہ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	سعودی عرب	☆ پروفیسر قاضی محمد یوسف	حسن ابدال
☆ مولانا عبداللہ عابد سندھی	شکارپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین	بہاولپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر	لاہور

www.rahimia.org

قیمت فی شمارہ : -/150 روپے

سالانہ زرِ تعاون -/600 روپے

شعبۂ مطبوعات

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) رجسٹرڈ لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

Ph: 0092-42-36307714 , 36369089 - Web: www.rahimia.org

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرست مقالات

اداریہ	حرفِ اوّل	مدیرِاعلیٰ	3
ولی اللّٰہی افکار؛ عصری اہمیت	حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف	از حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری	5
مطالعۂ سیاسیات	اسلام میں سیاست اور ریاست کا تصور	تحریر ڈاکٹر محمد ناصر☆	55
مطالعۂ سیرت	عہدِ نبوی ﷺ میں یمن میں اشاعتِ اسلام ایک مطالعہ	تحریر حافظ محمد سرفراز غنی☆	93
مطالعۂ قرآنیات	کثیر المذہبی معاشرے کے لیے قرآنی ہدایات	تحریر ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی☆	105

تعارف مقالہ نگار

☆ مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری — ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور و مسند نشین سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

☆ ڈاکٹر محمد ناصر — ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامیات، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، جھنگ

☆ حافظ محمد سرفراز غنی — پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد

☆ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — سیکرٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعتِ اسلامی ہند، نئی دہلی

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اوّل

قوموں کی بقا اور ترقی کے لیے عصری تقاضوں کا شعور اور ادراک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی بھی فکر اور نظریے کو عمل میں لانے کے لیے روحِ عصر کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ پچھلے چودہ سو سال کی تاریخ گواہ ہے کہ دینِ اسلام کی صاف شفاف تعلیمات کی بقا کا راز یہ رہا ہے کہ ہر دور میں محققین علمائے ربانیّین اور ملک وملت کے سچے رہنماؤں نے بدلتے ہوئے زمانے اور حالات کے مطابق عصری تقاضوں کو سمجھا اور اپنے دور کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح حکمتِ عملی اختیار کی۔

برعظیم پاک و ہند میں اورنگزیب عالمگیرؒ کے بعد سیاسی و معاشی زوال اور فکری انحطاط پیدا ہوا۔ ایسے ماحول میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی عظیم مفکر، محقق، عالمِ ربانی اور روحِ عصر کی نباض شخصیت پیدا ہوئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے بدلتے ہوئے حالات میں دینِ اسلام کا ایک ایسا جامع اور محققانہ علمی انداز اور فکری اسلوب اختیار کیا، جو زوال کے دور کے عصری تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے بجا طور پر مجددانہ کردار ادا کرتے ہوئے قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، سیاست و خلافت اور معیشت کے علوم کو عقل، نقل اور کشف کی بنیاد پر علمی حوالے سے مرتب اور مدوّن کیا۔ پھر ایک مربوط فلسفیانہ علمی نظام بھی مرتب کیا، جو ''علمِ اَسرارِ الدین'' کے عنوان سے ان تمام علوم کی شرعی اور عقلی نوعیت واضح کرتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس علم میں تمام ادیان کے مسلمہ علمی قاعدے اور بنیادی ضابطے مرتب اور مدوّن کیے، جو ہر زمانے کے عصری تقاضوں اور پیش آنے والے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے اختیار کردہ حکمتِ عملی کی اساس واضح کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اپنے فلسفہ وفکر کو بیان کرتے ہوئے زمانے کے تغیرات وتبدلات کے مطابق نئی مثالوں اور نئی حکمتِ عملی اختیار کرنے کی اہمیت بھی بجا طور پر واضح کی۔

اورنگزیب عالمگیرؒ کی وفات (1707ء) سے لے کر آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر (1857ء) تک مسلم حکمرانی کا ڈیڑھ سو سالہ دور زوال پذیر رہا ہے۔ اس دور میں ابھی ہندوستان میں مسلمانوں کی بچی کھچی حکمرانی اور سیاست موجود تھی۔ شاہ صاحبؒ اور اُن کے صاحبزادگان اور تربیت یافتگان نے اس دور کے عصری تقاضوں کے تناظر میں اپنی فکری، علمی اور عملی جدوجہد کا دائرۂ کار متعین کیا۔ شاہ صاحبؒ نے دینِ اسلام کے جو مسلمہ قواعدِ کلیہ متعین کیے تھے، انھی کی عصری تفہیم کی بنیاد پر امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے لے کر تحریکِ حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اور اُن کی متبع جماعت کی جدوجہد رہی ہے۔

1857ء میں ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے قومی دور کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے متعین کردہ اصولوں پر بدلتے ہوئے عصری تقاضوں کا شعور رکھنے والی اولوالعزم ولی اللّٰہی جماعت سامنے آتی ہے۔ اس کے سرخیل سیّد الطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امامِ ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں۔ اس جماعت نے دارالعلوم دیوبند ایسا مرکزِ علوم قائم کیا، جس میں ولی اللّٰہی فکر وفلسفے کی بنیاد پر دینِ اسلام کی محققانہ تفہیم کا نظام بنایا گیا۔ تمام دینی علوم کو علمی اور فنی بنیادوں پر پڑھنے پڑھانے کے لیے رجالِ کار تیار کیے۔ نیز بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے تناظر میں مسلمانوں کی بین الاقوامی حکومت 'خلافتِ عثمانیہ' سے روابط استوار کیے۔ یوں آزادی اور حریت کی جدوجہد کے لیے شعوری حکمتِ عملی مرتب کی۔

www.rahimia.org

1857ء سے لے کر جنگِ عظیم دوم (18-1914ء) کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے تک ان حضرات کی تربیت یافتہ جماعت نے عصری چیلنجز کو سامنے رکھا۔ آزادی اور حریت کے لیے ''جمعیت الانصار'' اور ''تحریکِ ریشمی رومال'' ایسی انقلابی تحریکات روحِ عصر کی تفہیم کی زندہ مثالیں ہیں۔ ان تحریکات کے قائدِ اعلیٰ اور سرپرست حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور قطبِ عالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ ایسی عظیم انقلابی شخصیات رہی ہیں۔ انھوں نے پوری حکمتِ عملی کے ساتھ علومِ دین کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اجتماعی قومی تقاضوں کی تکمیل کے لیے ان تحریکات کو منظّم کیا اور ان کی ہر طرح سے سرپرستی کی۔

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کے لیے عصری تقاضے یکسر بدل گئے۔ یورپین طاقتوں کا دنیا پر قبضہ ہوگیا۔ سامراجی قوتوں نے مظلوم انسانوں کو یرغمال بنا لیا۔ مسلمان ملکوں کی قومی اور بین الاقوامی اجتماعیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ ریاستوں کی تشکیل قومیّتوں کی اساس پر ہونے لگی۔ ایسے ماحول میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے متعین کردہ فلسفہ وفکر کی روشنی میں عصری چیلنجز کو سمجھنا اور اُن کے حل کرنے کے لیے درست حکمتِ عملی بنانا انتہائی ناگزیر تھا۔ چناں چہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے تربیت یافتگان نے اپنے دور کے عصری تقاضوں کو سمجھا۔ عالمی سیاست کے نشیب و فراز کا اِدراک کیا۔ ان حضراتؒ کی رہنمائی میں علمائے ہند کی اجتماعیت نے عصری تقاضوں کا ادراک کرتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر نپی تلی رائے قائم کی اور آزادی و حریت کے حوالے سے انقلابی سیاست کی طرح ڈالی۔ چناں چہ مفتیٔ اعظم مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، قطب الارشاد مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کا طرزِ فکر و عمل قومی ریاستوں کی تشکیل کے معروضی اور عصری تقاضوں کی تفہیم سے عبارت ہے۔

خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں عملی تحریکات کو منظّم کرنے والی شخصیت امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اپنی ایک نمایاں حیثیت اور مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اقوامِ عالم اور مختلف ممالک کے اسفار کے دوران یورپین فکر و فلسفہ اور بین الاقوامی انقلابات کا گہرا مطالعہ کیا اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ انھوں نے قومی جمہوریتوں کے دور کے معروضی حقائق کو سمجھا اور اسلام کی بقا کے عصری تقاضوں کی نشان دہی کرتے ہوئے انقلابی فکر و عمل کی راہ دکھائی۔ یہی وہ راہ ہے، جس کی ترجمانی ''خطبات جمعیت علمائے ہند''، ''نقشِ حیات'' اور ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' ایسی تاریخی کتابوں میں نظر آتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد عصری تقاضوں کی نوعیت ایک نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ اس ملک کی تعمیر و تشکیل ریاستوں کے بین الاقوامی نظام کے تحت ہوئی۔ ایسے ماحول میں ضرورت تھی کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و عمل کی روشنی میں دینِ اسلام کی آفاقی تعلیمات پر علمی اور فکری طور پر ریاستی تشکیل کے قومی اور بین الاقوامی امور کا شعور حاصل کیا جائے۔ اسی ولی اللّٰہی جماعت کے تربیت یافتہ حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ نے پاکستان کے عصری تقاضوں کے تناظر میں ولی اللّٰہی علوم و افکار کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے فروغ کے لیے بڑی عظیم جدوجہد کی۔ یہی وَجہ ہے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس خطے کے اہلِ علم و فکر میں ولی اللّٰہی علوم و افکار سے شعور و آگہی کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ملکی جامعات میں آج کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تناظر میں ولی اللّٰہی فکر سے واقفیت کے لیے خرد افروز سیمینارز، خطبات و لیکچرز اور علمی اور فکری نشستوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اسی حوالے سے پاکستان کی اہم جامعہ بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان نے ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور عصرِ حاضر'' کے عنوان سے ایک چار روزہ لیکچر سیریز کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقع پر پیش کیے گئے مقالات تحقیق و تخریج کے بعد ''شعور و آگہی'' کے قارئین کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس شمارے میں اس سلسلے کا پہلا مقالہ اور دیگر کئی اہم مقالات شاملِ اشاعت ہیں۔ (مدیرِ اعلیٰ)

www.rahimia.org

ولی اللّٰھی افکار؛ عصری اھمیت

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف

از: حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(1)

(دو سال قبل مؤرخہ 3/نومبر 2016ء کو پاکستان کی معروف تعلیمی درس گاہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں شعبہ علومِ اسلامیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب کی دعوت پر حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ نے ''اسلام اور عدلِ اجتماعی'' کے موضوع پر لیکچر دیا تھا، جو ''شعور وآگہی'' کے گزشتہ شمارے میں ترتیب وتدوین کے بعد شائع ہو چکا ہے۔ اس موقع پر صدر شعبۂ اسلامیات نے حضرت آزاد رائے پوری کو یونیورسٹی میں ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصرِ حاضر'' کے عنوان پر خطبات دینے کی ایک لیکچر سیریز کی دعوت دی تھی۔

اسی سلسلے میں حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم نے موسیٰ پاک شہید چیئر شعبہ علومِ اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے زیرِ اہتمام اپریل 2017ء میں درجِ ذیل عنوانات پر چار روزہ لیکچر دیے:

1۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف　2۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اَسرارِ دین
3۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت　4۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ ارتفاقات

ان میں پہلا لیکچر مؤرخہ 17/اپریل 2017ء بروز سوموار کو سیمینار ہال، شعبہ علومِ اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ہوا۔ اس سیشن کی صدارت صدرِ شعبہ علومِ اسلامیہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر فریدہ یوسف (شعبہ علومِ اسلامیہ زکریا یونیورسٹی) نے سرانجام دیے۔ لیکچر سیریز کی اہمیت واضح کرنے کے لیے تعارفی خطاب پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن مسئول موسیٰ پاک شہید چیئر شعبہ علومِ اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی نے کیا۔ ان مجالس میں شعبہ علومِ اسلامیہ کے اساتذہ، طلبا اور ملتان شہر سے اہلِ علم و دانش اور علما نے بھی شرکت کی۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ اس کے بعد صدرِ مجلس نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔

پیشِ نظر مقالہ اسی لیکچر سیریز کے پہلے خطبے پر مشتمل ہے۔ حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے لیکچر دینے کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں سے بہت سے اقتباسات جمع کیے تھے۔ مقالے کی تخریج و تحقیق کرتے ہوئے انھیں متعلقہ مقامات پر مقالے میں شامل کر دیا گیا ہے، تاکہ شاہ صاحبؒ کی اصل عبارتیں بھی قارئین کے سامنے رہیں۔ اس مقالے پر حضرت رائے پوری نے نظرِ ثانی اور تحقیق و تخریج کی ہے اور اسے تحریری صورت دیتے ہوئے عبارتوں کی نوک پلک درست اور حک و اضافہ بھی کیا ہے۔ اس طرح یہ لیکچر ایک مکمل مقالے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہم حضرت رائے پوری مدظلہٗ کے شکریے کے ساتھ اس وقیع علمی کاوش کو قارئین ''شعور وآگہی'' کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ مدیر)

www.rahimia.org

تعارفی خطاب

از ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن (مسئول موسیٰ پاک شہید چیئر)

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم. أمّا بعد!

جناب محترم صدرِ مجلس ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب اور آج کے مہمانِ خصوصی محترم حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری صاحب، معزز اساتذۂ کرام اور عزیز طلبا و طالبات!

چند مختصر باتیں عرض کروں گا، تاکہ اس کے بعد باقاعدہ لیکچر کا آغاز ہو سکے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس لیکچر سیریز کا اہتمام موسیٰ پاک شہید چیئر کے تحت ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ سولھویں صدی عیسوی کی شخصیت ہیں۔ خانوادہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ان کا تعلق ہے۔ ان کا اس خطے میں ایک بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ جہاں تصوف میں ان کا کام ہے، اسی طرح وہ معاشرتی اور سماجی زندگی سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اکبر کا دور تھا اور اس دور میں باقاعدہ حکومت سے ان کا تعلق رہا ہے۔ اس طور پر نہیں کہ اس حکومت کے محض آلہ کار تھے، یقیناً اُن کے پاس سرکاری منصب تھا، لیکن کبھی بھی کسی شرعی مسئلے پر انھوں نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہمیں ان کی زندگی میں ایک بڑی متوازن شخصیت ملتی ہے۔

آج سے تقریباً چھ سات سال پہلے یونیورسٹی میں اس چیئر کا باقاعدہ اعلان ہوا تھا۔ جب اس وقت پاکستان کے وزیرِاعظم یوسف رضا گیلانی تھے۔ اس چیئر کے تحت ابھی تک موسیٰ پاک شہیدؒ کے حالاتِ زندگی پر ایک کتاب مرتب ہوکر شائع ہوچکی ہے۔ ان کے تذکرے کے حوالے سے چند مذاکرے ہوئے ہیں اور اسی طرح اَور بھی کچھ کام ابھی زیرِ ترتیب ہیں۔

آج کی یہ نشست اس حوالے سے ہے کہ موسیٰ پاک شہیدؒ سے علمی طور پر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا بھی تعلق ہے۔ علمی سلسلہ اس طرح بنتا ہے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (1762ء) کے والد شاہ عبدالرحیم دہلویؒ (1719ء)، اُن کا سلسلۂ شیخ ابورضا محمد دہلویؒ (1690ء) اور ان کا سلسلۂ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (1642ء) اور پھر موسیٰ پاک شہیدؒ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہماری تاریخ کا بہت بڑا نام ہے۔ اُن کی بہت سی تصانیف ہیں۔ علمی طور پر اُن کا بہت بڑا مقام ہے۔ وہ چار سال تک ملتان میں اپنے شیخ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے پاس رہے۔ جس سے ہمیں ان کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو اُن کا اپنے شیخ کے ساتھ تھا۔ اس چیئر کے تحت آج یہ پروگرام جس شخصیت یعنی حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ پر ہو رہا ہے، ان کا نام تو آپ نے کافی سنا ہے۔ تقریباً ہمارے جتنے بھی مضامین (subject) ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، سب میں ان کا تذکرہ اور اِن کی خدمات کا ذکر ہے۔

اس لیکچر سیریز کا مقصد بنیادی طور پر یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اُس فکر سے آگہی حاصل کی جائے، جس کا

www.rahimia.org

تعلق سماج کی تشکیل سے ہے کہ انھوں نے سوسائٹی کی نئی تشکیل کے لیے افکار پیش کیے۔ کیوں کہ اُن کے دور میں سماج ٹوٹ رہا تھا۔ ایسے میں ایک نئے سماج کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نئے سماج کے لیے انھوں نے کیا بنیادی رہنما اصول دیے؟ موضوع خاصا وسیع ہے اور یقیناً اس سیریز سے اس کا پورا حق تو ادا نہیں ہوگا، لیکن سرِدست یہی ممکن تھا کہ چار موضوعات پر سیریز کا انعقاد کیا جائے۔ انشاء اللہ ممکن ہوا تو دیگر موضوعات پر بھی کسی اَور موقع پر اس کا اہتمام ہوگا۔

اس مقصد کے لیے جس شخصیت کو آج ہم نے مدعو کیا ہے، میرے علم کے مطابق اس وقت پاکستان میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر پر اور ان کی تصانیف پر ان سے زیادہ گہری نظر کسی کی نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب اُن کی کتابوں کا نہ صرف خود ادراک رکھتے ہیں، بلکہ باقاعدہ ان کتابوں کی تدریس بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کتابوں پر براہِ راست ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ اور محض کتابی نظر نہیں، بلکہ آج کے حالات کے اعتبار سے اس فکر کا اطلاق (application) کیا ہے؟ اس پر بھی ان کی نظر ہے۔ شاہ صاحبؒ کا پس منظر، پیش منظر دونوں چیزیں ان کے سامنے بہت واضح ہیں۔ انشاء اللہ جب آپ ان کے لیکچرز سنیں گے تو یقیناً آپ کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔

وہ اس وقت ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ اس ادارے کے تحت ان کی کئی تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ کئی ایک کتابوں کے تراجم وہ کر چکے ہیں۔ صاحبِ تصنیف و تالیف ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ طریقت بزرگ بھی ہیں۔ خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور ایک بہت معروف علمی، روحانی خانقاہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا سماجیات و سیاسیات سے بھی بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر آپ تحریکِ ریشمی رومال کی تاریخ کو پڑھیں گے تو اس میں بھی اس خانقاہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض ایک روایتی خانقاہ نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر جہاں ذکر ہے، وہاں فکر بھی ہے۔ علم بھی، عقیدت بھی ہے اور شریعت کی گفتگو بھی ہے۔ طریقت کے موضوعات پر بھی بات چیت ہے۔ جو علمی سیاست ہے، اس پر گفتگو بھی ہے۔

آج کی سب سے بڑی ضرورت —— جس کی آج ہمیں سوسائٹی میں کمی محسوس ہوتی ہے —— وہ فکر اور بصیرت کی ہے۔ اسلام کے حوالے سے ہمارے ہاں تحریکی مزاج تو بہت ہے، اس پر بہت سا کام ہوا، بہت سے لوگ اس پر کام کر بھی رہے ہیں، لیکن جس چیز کی بہت بڑی کمی ہے، وہ فکر اور بصیرت کی ہے۔ اور جب تک فکر و بصیرت نہ ہو تو اس کے بغیر تحریکیں جذبات کا شکار ہوتی ہیں، حالات کا شکار ہوتی ہیں۔ جمود کا شکار ہوتی ہیں۔ ردّعمل کا شکار ہوتی ہیں۔ اور آج ہم سوسائٹی میں انھیں چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔

انشاء اللہ اس لیکچر سیریز سے آپ کو بہت کچھ سننے کا، سمجھنے کا اور غور و فکر کرنے کا موقع ملے گا۔ اب میں بغیر کسی تاخیر کے درخواست کروں گا حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری سے کہ وہ تشریف لائیں اور آج کے موضوع یعنی ''حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارُف'' پر گفتگو فرمائیں اور سامعین کو اس موضوع کے حوالے سے مستفید فرمائیں۔

www.rahimia.org

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم. أمّا بعد!

فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (1)

و قال النّبیّ ﷺ: ''کانت بنو إسرائیل تسوسھم الأنبیاء، کلّما ھلک نبیّ خلفہٗ نبیّ آخر. ألا! لا نبیّ بعدی، سیکون بعدی خلفاء فیکثرون.'' (2)

و قال النّبیّ ﷺ: ''لا تزال طائفۃ من اُمّتی قائمین علیٰ الحقّ، لا یضرّھم من خالفھم.'' (3)

و قال النّبیّ ﷺ: ''إنّ اللّٰہ یبعث لھٰذہ الاُمّۃ علیٰ رأس کلّ مائۃ سنۃ من یجدّد لھا دینھا.'' (4)

صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہٗ النّبیّ الکریم.

کلماتِ تشکر

محترم حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب (مسئول موسیٰ پاک شہید چیئر)، محترم جناب ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب (صدر شعبہ علومِ اسلامیہ)، معزز اساتذۂ کرام، علمائے کرام، طلبائے عظام اور معزز بہنوں اور بھائیو!

سب سے پہلے تو میں اپنی تمام تر کم علمی اور کوتاہی کے باوجود آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ اہلِ علم کی اس محفل میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت، افکار و تعلیمات اور عصرِ حاضر میں اس کی ضرورت پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ علم و فکر کے مراکز میں علمی گفتگو، علمائے ربانیین کے تذکرے اور ان کے افکار و تعلیمات سے آگہی یقیناً علم کی شمع کو فروزاں کرنے کا باعث بنتی ہے۔ انسانی سوسائٹی کی ترقی علوم ہی کے سبب سے ہوتی ہے۔ جتنے اونچے درجے کا علم اور نالج (knowledge) ہوتا ہے، اتنا ہی معاشرے ترقی کرتے ہیں۔ جہاں علمی پستی اور فکری افلاس پایا جاتا ہے اور جہالت کے اندھیرے ہوتے ہیں، ایسے معاشرے زوال کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ہر دور میں مجددین کی ضرورت

دینِ اسلام علم کی شمع روشن کرتا ہے۔ علومِ نبوت اس کی اساس ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر علم و فکر میں حیلہ جَو طبیعتیں بہت سی ایسی چیزیں داخل کردیتی ہیں، جس سے علم کا اصل چہرہ سامنے نہیں رہتا۔ اسی لیے علوم کو اپنی اصل شکل میں واضح کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زمانے کا تغیر ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ جس کا انکار ممکن نہیں لحظہ لحظہ بدلتے زمانے کا تقاضا ہوتا ہے کہ سماجی زندگی کے دائرے میں جو جدید مسائل پیدا ہوچکے ہیں ان کا حل تلاش کیا جائے، چناں چہ دینی فکر بھی دَور کے اس تقاضے سے باہر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے ہر دور کے بدلتے تقاضوں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''ألا! لا نبیّ بعدی، سیکون بعدی خلفاء فیکثرون.'' (5)

(خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ میرے بعد خلفا ہوں گے اور وہ بہت کثرت سے ہوں گے۔)

www.rahimia.org

ایک دوسری حدیث میں ان خلفائے مجددین کا تذکرہ کرتے ہوئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

''إنّ اللّٰہ یبعث لھٰذہ الاُمّة علیٰ رأس کُلِّ مائة من یجدّد لھا دینھا.'' (6)

(بے شک اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لیے ہر سو سال کے شروع میں ایسے لوگ بھیجے گا، جو اس (اُمت) کے لیے دین کو نیا اور تازہ کرتے رہیں گے۔)

اس ارشادِ نبویؐ سے واضح ہوا کہ ہر دور کے لیے مجدد کا ہونا ضروری ہے، تاکہ مرورِ زمانہ سے دین کے عملی نفاذ کی راہ میں جو رُکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں انھیں دور کیا جائے۔ اور دینی فکر اپنی تمام تر تازگیوں اور لطافتوں کے ساتھ نکھر کر سامنے آجائے۔ اور یوں اس کی سحر انگیز نکہتوں سے پوری انسانیت معطر ہوجائے، اور اس کے فطری ارتقا کا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے۔

منصبِ مجددیّت کی حقیقت اور ذمہ داریاں

مجدد کا کام یہ ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے دور میں وہ ایمانیات کے تقاضوں کی تشریح کرتا ہے۔ علومِ نبوت کی روشنی میں اس دور کے فرائض و واجبات اور مَنہیات (جن چیزوں سے روکا جانا ضروری ہے) کی نشان دہی کرتا ہے۔ شریعتِ مقدسہ کو ہر قسم کی رسمی جکڑ بندیوں، فرقہ پرستیوں سے پاک کر کے خالص علومِ نبوت اور ان کے تقاضوں کی وضاحت کرتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے منصبِ مجددیّت کی حقیقت اور ذمہ داریاں واضح کی ہیں اور یہ بتلایا ہے کہ مجدد کون ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داریاں اور تقاضے کیا ہیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''من مناصب دورة الإیمان منصب المجدّدیة... والمجدّد رجل رزقه اللّٰہ سبحانهٗ حظّاً من علم القرآن و الحدیث، ثمّ ألبس لباس السّکینة، فجعل یضع التّحریم، و الوُجوب، و الکراھیة، و الاستحباب، و الإباحة موضعھا. و یُنقِّح الشّریعة عن الأحادیث الموضوعة، و اقیسة القائسین، و عن کُلِّ إفراطٍ و تفریط، ثمّ أظمأ اللّٰہ أکباداً إلیه، فاخذوا عنه العلم.

و الفرق بینه و بین الوصی أنّه متعلِّم من ظاھر العلم، و الوصی أخذه حظّه من شرح رسول اللّٰہ ﷺ، ثمّ وفّقه بظاھر العلم، و عندنا انّ ''المائة'' تخمینٌ، لا تعیینٌ، و یعتبر من وفاته ﷺ.'' (7)

(ایمانی دور کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم عہدہ مجددیت کا منصب ہے۔... مجدد ایسے آدمی کو کہتے ہیں کہ جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے علومِ قرآن اور علمِ حدیث کا بڑا وافر حصہ عطا کیا ہو۔ پھر اس کو اطمینان و سکینت کا لباس پہنایا ہو۔ پھر وہ (علومِ نبوت کی روشنی میں) حرام، واجب، مکروہ، مستحب اور مباح کو صحیح طور پر متعین کرتا ہے۔ وہ شریعت کو موضوع احادیث سے الگ کر کے صاف طور پر بیان کرتا ہے۔ اسی طرح قیاس کرنے والوں کے ہر طرح کے خیالات اور افراط و تفریط سے اُسے پاک کرتا ہے۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ اس سے علومِ نبوت حاصل کرتے ہیں۔

''مجدد'' اور ''وصی'' کے درمیان فرق یہ ہے کہ مجدد ظاہری علمِ نبوت کا طالبِ علم ہوتا ہے اور وصی رسول اللہ ﷺ کے سینے سے پھوٹنے والے نورِ نبوت سے اپنا حصہ حاصل کرتا ہے۔ پھر اس کو ظاہری علم کے ساتھ تطبیق دیتا ہے۔

ہمارے نزدیک حدیث میں مجدد کی آمد سے متعلق جو سو سال کا تذکرہ آیا ہے وہ اندازاً ہے۔ سو کا عدد کوئی متعین شدہ نہیں ہے۔ اور اس کا آغاز حضور اکرم ﷺ کی وفات سے ہوتا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ تقریباً ہر سو سال بعد ایک مجدد ضرور آئے گا، یا مجددین کی ایک جماعت ضرور آئے گی، جو علمی اور فکری بنیادوں پر ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات، اختلاف وانتشار یا فطری اضمحلال کو ختم کر کے **علم الجمع بین المختلفات** (اختلافی مسائل میں جمع وتطبیق کا علم) کے حوالے سے علمی کام کرتے ہیں۔ اس طرح دین کے اصل علم وفکر اور شعور وبصیرت کو انسانیت کے سامنے نکھارتے ہیں۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ؛ اس دور کے ایک عظیم مجدد

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے دور کے ایک عظیم مجدد ہیں، جنھوں نے تجدیدِ دین کا کام کیا ہے۔ اس پر اٹھارہویں صدی سے لے کر اب تک مسلمانوں کے تقریباً تمام فرقے متفق ہیں۔ بلکہ غیر مسلموں کے ہاں بھی علمی اور فکری طور پر دین اسلام کی تعلیمات کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے تو شاہ صاحبؒ کے فکر کی اس مجددانہ اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے مجددیت کا منصب عطا کیا ہے۔ مجھے **علم الجمع بین المختلفات** میں کمال دیا ہے، یعنی؛ علمی آرا کے حوالے سے موجود اختلافات کو دین اسلام کی اصل تعلیمات اور واقعی حقائق کے تناظر میں سمجھنا، اور ان میں جو ممکنہ ابہامات اور مخمصے پیدا ہو چکے ہیں، انھیں دور کرنا ہے۔ شاہ صاحبؒ ''**التّفهيمات الإلٰهيه**'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''و لمّا تمّت بی دورة الحكمة، ألبسنى الله سبحانه خلعة المجدّدية، فعلمتُ علم الجمع بين المختلفات، و علمتُ أنّ الرّأى فى الشّريعة تحريف و فى القضاء مكرمة.'' (8)

(جب میرے لیے حکمت کا دور اور مرتبہ مکمل ہوگیا تو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے مجھے مجددیت کی خلعت (اعزازی لباس) سے نوازا۔ پس میں نے مختلف آرا کے درمیان جمع وتطبیق کا علم جان لیا اور میں نے جان لیا کہ شریعت میں ذاتی رائے سے گفتگو کرنا ایک طرح کی تحریف ہے، جب کہ (شریعت کی روشنی میں) پیش آمدہ مسائل کے بارے میں فیصلہ کن رائے دینا بڑے اعزاز کی بات ہے۔)

بلاشبہ شاہ صاحبؒ نے ایسا مجددانہ علمی اور فکری کام کیا ہے جس نے تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کے شعبوں میں علما کی مختلف اور متضاد آرا کو چھان پھٹک کر بنیادی علومِ نبوت کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے شریعتِ مقدسہ کو انفرادی آرا پر مبنی خیالات وتصورات سے نکال کر دینِ اسلام کے مجموعی نظام کے تحت مرتب اور منظّم کر دیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کے عملی سماجی تقاضوں کی نشان دہی کی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے اس علمی اور عملی کام نے ہندوستان میں بسنے والے انسانوں کی فکری، سیاسی اور معاشی زندگی پر بڑے گہرے اَثرات مرتب کیے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے علوم کا جامعیت پر مبنی مطالعہ اسی حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ نہ صرف شاہ صاحب، بلکہ اُن کے بعد اُن کے جانشین حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، پھر شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، حضرت سیّد احمد شہیدؒ، شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اور پھر ان کے سلسلے سے وابستہ بعد میں آنے والے ولی اللّٰہی بزرگوں نے یہی علمی اور عملی جامعیت پائی ہے۔ حقیقت میں علما وہی ہیں کہ جو

مختلف اور منتشر چیزوں کو ایک مربوط اور جامع فلسفہ وفکر کے تحت میں سمجھنے سمجھانے کی اہلیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اس خطے کے لوگوں پر شاہ صاحبؒ کا بہت بڑا احسان ہے، جس کا انکار ممکن نہیں۔ آج ہماری زندگی میں دینِ متین جس شکل میں محفوظ ہے، وہ دراصل ولی اللّٰہی جماعت کے اسی مجددانہ کام کی بدولت ہی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ برعظیم (پاک و ہند اور بنگلادیش) اور اس کے اَطراف واَکناف میں جتنے لوگ بھی صحیح دینی مزاج رکھنے والے ہیں، ان کے علم وفکر اور سیرت و کردار کا سلسلۂ سند امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہی جا ملتا ہے۔

انبیاؑ کے وارث علما کی ذمہ داریاں

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مجدد کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اپنے مکتوبات میں اس حدیثِ نبویؐ:

''**العلماء ورثة الأنبياء**''(9) (علما انبیاؑ کے وارث ہیں)

کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

''نبی اکرمؐ کے علوم کی وراثت دو پہلوؤں سے ہے۔ باقی علوم تو نبی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔ اس میں تو وحی یا نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ انبیاؑ کے جاری رہنے والے دو علوم ہیں: (۱) علم الاحکام اور (۲) علم الاسرار۔''(10)

علم الاحکام سے انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے بنیادی قوانین اور ضابطے معلوم ہوتے ہیں۔ اس علم میں شریعت کی تعلیمات کی بنیاد پر ان سوالات کے جوابات پنہاں ہوتے ہیں کہ سوسائٹی کو کس رُخ پر آگے بڑھنا ہے؟ اس کا نظم و ضبط اور ڈسپلن، اس میں احکامات اور قوانین، ضابطے اور قواعد کس نہج پر مرتب ہونے چاہئیں؟ جب کہ دوسرا علم ''علم اسرار دین'' ہے، جس میں علم الاحکام کی حکمتیں اور اَسرار یعنی اس کا مربوط فلسفہ وفکر بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت مجدد صاحب نے لکھا ہے کہ:

''جو علما صرف علم الاحکام کے ماہر اور صرف شرعی مسائل بتلا سکتے ہوں اور علم الاسرار نہ جانتے ہوں، وہ حضورؐ کے علوم کے پورے وارث نہیں ہیں۔ جو لوگ صرف علم الاسرار پر واقفیت رکھتے ہوں، اور شریعت کے احکامات سے آگاہ نہ ہوں، تو وہ بھی دراصل انبیاؑ کے وارث نہیں ہیں۔ علم الاحکام اور علم الاسرار دونوں علوم کے جامع اہل علم انبیاؑ کے وارث ہیں۔''(11)

بلاشبہ مجدد الف ثانیؒ نے جو تجدیدی کام شروع کیا، اس کی تکمیل حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمائی۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت کا مختصر تعارُف

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اٹھارہویں صدی کی عظیم ترین شخصیت ہیں۔ آپؒ ۴/ شوال ۱۱۱۴ھ/ 21/ فروری 1703ء بروز بدھ کو بہ وقت طلوعِ آفتاب قصبہ پُھلت (ضلع مظفرنگر، یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔(12) آپؒ کا انتقال ۳۰/ محرم ۱۱۷۶ھ/ 21/ اگست 1762ء بروز ہفتہ کو صبح کے وقت ہوا۔(13) آپؒ کی زندگی کا دورانیہ قمری حوالے سے اکسٹھ سال چار مہینے اور شمسی حوالے سے ساٹھ سال سے بھی سات ماہ کم ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی کے اس ساٹھ سالہ تاریخی دورانیے کا

www.rahimia.org

تجزیہ کرنا ضروری ہے، تا کہ ان کی شخصیت اور تجدیدی کام کی اہمیت واضح ہوجائے۔ یہ دور وہ ہے کہ جس میں 1707ء میں اورنگزیب عالمگیرؒ کا انتقال ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کا وہ پچاس سالہ (1658ء تا 1707ء) سنہرا دور اختتام پذیر ہوتا ہے، جس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی اپنے والدِگرامی سے تعلیم و تربیت

شاہ صاحبؒ شوال ۱۱۱۹ھ/فروری 1708ء میں پانچ سال کی عمر میں مکتب میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے۔ سات سال کی عمر میں آپؒ نے قرآن حکیم ختم کیا اور دہلی میں مروّجہ نصابِ تعلیم کے مطابق علوم وفنون اور تفسیر و احادیث کی کتابوں کی تعلیم میں مشغول ہوگئے۔ دس برس کی عمر میں تھے کہ از خود مطالعے سے کتابوں کو حل کرنے کی استعداد پیدا ہوگئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے 15 سال کی عمر میں اپنے دور کے تمام علوم وفنون پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ چناں چہ خود ''**الجزء اللّطیف**'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم وفنون پڑھ لیے تھے، ...اللہ تبارک وتعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے مجھ پر ایک احسان یہ ہے کہ چند مرتبہ والد بزرگوار کی خدمت میں رہ کر قرآن عظیم کا درس کچھ اس طرح لیا کہ اُس کے معانی میں غور و تدبر اور اس کے شانِ نزول اور کتبِ تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہوئے پڑھا۔ اس طرح کلامِ قدسی میں تدبر حاصل کرنے کا موقع ملا، جو میرے لیے ایک عظیم فتح تھی اور اس پر خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''(14)

اس طرح انھوں نے دس سال تک اپنے والدِگرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ سے تمام علوم پڑھے۔ کوئی علم نہیں چھوڑا۔ اس طرح حضرت شاہ صاحبؒ پر علومِ قرآنیہ کا دروازہ کھل گیا۔ انھیں قرآن حکیم اور سنتِ رسول اللہ کا پورا فیضان نصیب ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے والدِگرامیؒ سے خاص طور پر حکمتِ عملی کے آداب اور طریقۂ کار سیکھے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ ''انفاس العارفین'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایں فقیر را در مجلسِ صحبتِ حکمتِ عملی و آدابِ معاملہ بسیار مے آموختند۔''(15)
>
> (انھوں نے اس فقیر کو اپنی مجلسِ صحبت میں بہت سے حکمتِ عملی اور معاملات کے آداب سکھلائے۔)

شاہ صاحبؒ نے اس دور کی اصلاح اور درستگی میں حکمتِ عملی کی اہمیت کو سمجھا اور کتاب وسنت کے دلائل سے اسے سمجھایا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''وحکمتِ عملی کہ صلاحِ ایں دورہ دراں است، بہ وسعتِ تمام افادہ نمودند، وتوفیق تشییدِ آں بہ کتاب وسنت و آثارِ صحابہ دادند۔''(16)
>
> (اس دور کی اصلاح اور درستگی کا دار و مدار حکمتِ عملی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام تر وسعت کے ساتھ اس کے فوائد مجھ پر ظاہر کیے۔ مجھے توفیق دی ہے کہ کتاب وسنت اور صحابہؓ کے آثار کے دلائل سے اسے مضبوط بناؤں۔)

ظاہری علوم کے حصول کے زمانے میں آپؒ کے ذہنِ رسا میں ہر علم وفن کے کئی قیمتی اور اہم نکات پیدا ہوتے رہے، جس سے مزید غور وفکر کی کئی اَور راہیں کھلتی چلی گئیں۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''دریں میان سخنانِ بلند در ہر فن بہ خاطر مے رسیدند، و از کوشش زیادہ تر کشادِ کار بہ نظر مے آمد۔''(17)

www.rahimia.org

(علوم کے حصول کے دوران ہر فن میں بلند ترین خیالات میرے دل میں آتے رہے اور اپنی کوشش سے ان علوم کی وسعت اور کشادگی میری نظر میں آتی رہی۔)

۱۱۲۹ھ/1717ء میں ظاہری تعلیم مکمل ہوئی اور اس کے بعد تربیتِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلے میں آپؒ کے مشائخ میں سرِفہرست آپؒ کے والدِ گرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ ہیں، جن سے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ قادریہ چشتیہ اور سہروردیہ حاصل کیا۔ دوسرے شیخ حضرت شیخ ابوطاہر کردی مدنیؒ ہیں، جن سے ان تمام سلاسلِ عالیہ کی اجازت آپؒ کو حاصل ہے۔ شاہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

''پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار سے بیعت کر کے اشغالِ صوفیا، خصوصاً مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مصروف ہوگیا اور ان کی توجہ اور تلقین سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے آدابِ طریقت کی تعلیم اور خرقۂ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کرلیا۔''(18)

اور پھر تمام ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد تقریباً سال ڈیڑھ سال انھوں نے اپنے والدِ گرامیؒ سے سلسلۂ تصوف و ارشاد سیکھا، جس میں نقشبندی، قادری، سہروردی، چشتی چاروں سلاسل کی تعلیم و تربیت حاصل کی اور روحانی مقامات طے کیے۔

اپنے والدِ گرامیؒ کی مسندِ درس پر

جب حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ سترہ سال کی عمر میں اُن کے جانشین بنے۔ علومِ ظاہری اور باطنی کی تکمیل کی۔ پھر خود شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''سال ہفت دہم از عمرِ فقیر حضرتِ ایشاں (والدِ گرامی) مریض شدند، و در ہماں مرض بہ رحمتِ حق پیوستند، و در مرضِ موت اجازتِ بیعت و ارشاد دادند، وکلمۂ ''یدہٗ کیدی'' مکرر فرمودند۔''(19) (اس فقیر کی عمر جب سترہ سال تھی تو حضرت والد صاحب مریض ہوگئے اور اسی مرض میں حق تعالیٰ کی رحمت میں پیوست ہوگئے۔ فقیر کو مرض الموت میں بیعتِ ارشاد کی اجازت عطا فرمائی اور بار بار یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ: ''اس کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے۔'')

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے بارہ سال تک تمام دینی اور عقلی کتابیں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھائیں۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں:

''بعد از وفات حضرتِ ایشاں دوازدہ سال کم و بیش تدریس کتبِ دینیہ و عقلیہ مواظبت نمود، و در ہر علم خوض واقع شد۔''(20) (حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد میں نے تمام علومِ دینیہ و عقلیہ کم و بیش بارہ سال تک مسلسل پڑھائے اور ہر علم میں بڑی دِقتِ نظر کے ساتھ غور وخوض کیا۔)

ہر علم سے متعلق جتنی بھی کتابیں دستیاب تھیں، اُن کے مطالعے کے ساتھ محققانہ نقطہ نظر سے شاہ صاحبؒ نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ بارہ سال تک جاری رکھا۔ اس دوران ہر علم پر غور وفکر کر کے اُس کے بنیادی اصول، ضابطے اور قاعدے، اُن کی تلخیصات آپؒ کے ذہن نے متعین کیں۔ علم کا ہر شعبہ مرکزی علم کی شاخ ہے۔ اور پھر علوم کی مختلف شاخوں کے درمیان جو وحدت پائی جاتی تھی، اُن کو مربوط طور پر سمجھنے کا امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو موقع ملا۔

بارہ سال کی اس تحقیق اور تدریس کے نتیجے میں شاہ صاحبؒ کے دل میں علم کا ایک بہت بڑا وسیع سمندر سما گیا۔ چناں چہ

انھوں نے اُسی زمانے میں علوم کی تلخیصات اور علوم کی تہذیب و تدوین شروع کردی۔ تقریباً دس سال کی تدریس کے بعد ترجمہ قرآن حکیم (فتح الرّحمٰن بترجمة القرآن) اسی بارہ سالہ دور کے آخری سالوں میں (۱۱۴۰ھ/1728ء) شروع کیا تھا۔ اُسی وقت شاہ صاحبؒ نے غالبًا اپنی سب سے پہلی تصنیف ''المقدّمه فی قوانین التّرجمه''لکھنا شروع کی، جس میں شاہ صاحبؒ نے ترجمہ نگاری کے مختلف اسالیب اور تراجم ہائے قرآن حکیم کا جائزہ لے کر ترجمہ نگاری کے اصول و قوانین مرتب کرنا شروع کیے۔ سورتِ بقرہ اور آلِ عمران پر مشتمل ''زھراوین'' کے عنوان سے ایک تفسیر بھی اُسی زمانے میں لکھی۔

پھر بیت اللہ الحرام کی کشش اور علوم کی طلب شاہ صاحبؒ کو حرمین شریفین لے گئی۔ بارہ سال کی اس تحقیقی تدریس و تعلیم کے بعد امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تقریباً دو سال (۸/ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ/ 21/ اکتوبر 1730ء تا ۱۴/ رجب ۱۱۴۵ھ/ یکم/ جنوری 1733ء) تک حرمین شریفین میں قیام پذیر رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے خانۂ کعبہ کے فیوض و برکات حاصل کیے۔ دو دفعہ حج کیا اور درمیان میں مدینہ منورہ میں نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے فیوضات و برکات حاصل کیے۔

حرمین شریفین کے قیام میں حضرت شاہ صاحبؒ کے دوسرے عظیم ترین استاذ شیخ ابوطاہر کردی مدنیؒ اور دیگر مشائخ حرمین ہیں۔ آپؒ نے ان سے علوم الحدیث اور دیگر علوم کی اجازت حاصل کی۔ اُن کے فیوضات و برکات حاصل کیے۔ اس طرح حرمین شریفین کی فیوضات و برکات سے مستقبل کے تمام امور کا ایک مربوط اور مکمل خاکہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ذہن میں آ گیا۔ جس کا اظہار شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حرمین شریفین کے فیوض و برکات کے نتیجے میں کن کن علوم کا فیضان ہوا ہے، اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ''الکعبة الحسناء'' کے فیوض و برکات نے علم کا دروازہ کھول دیا۔ انھیں علوم پر پوری طرح شرح صدر ہوگیا۔ ان کا سینہ علوم کے لیے کھل گیا۔ نبی اکرمؐ کے فیوضات و برکات سے علومِ نبوت کا فیضان فوجاً فوجاً اُن کے قلب اور دل و دماغ پر نازل ہونے لگا۔

یہ تمام علوم سمیٹ کر ۱۴/ رجب ۱۱۴۵ھ/ 2/ جنوری 1733ء کو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہندوستان واپس دہلی تشریف لاتے ہیں۔ اس کے بعد تقریباً تیس سال (۱۱۴۵ھ/ 1733ء تا ۱۱۷۶ھ/ 1762ء) آپؒ کا مرکزِ علم وفکر دہلی رہا ہے۔ ودیعت کردہ علوم وفنون پر کتابیں لکھیں۔ اس وقت دستیاب کتابیں کوئی پچاس ساٹھ کے قریب ہیں۔ اُن کتابوں میں جتنی بھی علمی اور فکری بحث امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے، ان کے اجمالی اشارے اور ان علوم کے اکثر بنیادی نکات ''فیوض الحرمین'' میں موجود ہیں۔ گویا کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اگلے دور کی تجدید کا اجمالی خاکہ حرمین شریفین میں ہی مرتب کرلیا تھا۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے اپنی خودنوشت میں آٹھ بنیادی علوم کا تذکرہ کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے حرمین سے واپس آ کر تقریباً تیس سال تک یہاں دہلی اور گردونواح میں اپنے فیوضات و برکات پھیلائے ہیں۔ اس دوران آخری سالوں میں نادر شاہ کے دہلی پر حملے کے سبب امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ دہلی سے ہجرت فرما کر اپنے آبائی وطن پُھلت میں تشریف لے گئے تھے۔ تقریباً دو ڈھائی سال (شعبان ۱۱۷۳ھ/ 1759ء تا ۸/ ذوالحجہ ۱۱۷۵ھ/ 1762ء) حضرت شاہ صاحبؒ کا پُھلت میں قیام رہا۔ انتقال سے تقریباً دو ماہ پہلے حضرت شاہ صاحبؒ دہلی تشریف لائے اور ۳۰/ محرم ۱۱۷۶ھ/ 21/ اگست 1762ء کو آپؒ کا انتقال ہوگیا۔ (21)

یہ شاہ صاحبؒ کی سیرت کے حوالے سے ایک مختصر خاکہ ہے۔

www.rahimia.org

شاہ صاحبؒ کے دور کے سیاسی، معاشی اور فکری حالات

اس دوران میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور فکری حالت دیگر معاصر تذکروں اور خود شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریرات سے جو واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس دور کی سوسائٹی علمی اور فکری انتشار سے دوچار تھی۔ فکری اضمحلال اور انتشار سوسائٹی میں موجود تھا۔ سیاسی عدمِ استحکام تھا۔ معاشی بدحالی اور طبقاتی نظام قائم تھا۔

کسی سماج کی تشکیل میں یہی تین بنیادی چیزیں ہوتی ہیں:

1۔ ایک یہ کہ کسی بھی معاشرے کے تجزیے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں علمی، فکری حوالے سے فلسفہ وفکر کی حالت کیا ہے؟ سوسائٹی میں وحدتِ فکری ہے یا انتشار ہے؟ سوسائٹی تبھی ترقی کرتی ہے کہ جب تمام لوگ ایک فکر پر متحد ہوں۔ ذہنی طور پر وہ بنیادی اساسی اصولوں پر متفق ہوں کہ کس طرح پورے معاشرے کو نئے خطوط پر آگے بڑھانا ہے۔

2۔ دوسرے یہ کہ اس طے شدہ فکر کی اساس پر ایک مربوط اور مستحکم سیاسی نظام قائم کیا جائے، جو امن و امان کو یقینی بنائے۔ ہر انسان کی جان، مال، عزت آبرو کا تحفظ کرے۔ ایسا ہونا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اگر بدامنی اور خوف کی حالت ہو تو معاشرے ترقی نہیں کرتے۔

3۔ تیسرے یہ کہ سوسائٹی کا معاشی نظام کیسا ہے؟ وہاں کے بسنے والے تمام انسانوں کی احتیاجات کی تسکین کا عدل و انصاف پر مبنی نظام قائم ہونا ضروری ہے۔ سوسائٹی میں معاشی خوش حالی ہوگی تو وہ ترقی کرے گی، ورنہ بھوک و افلاس کی حالت میں معاشرے ناکام ہوجاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں مثالی معاشرے کی سیاسی اور معاشی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۝ (22)

(اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے کہ جو امن والی تھی اور ایسی مطمئن حالت میں تھی کہ اس کا رزق وافر مقدار میں ہر طرف سے آرہا تھا۔ انھوں نے اللہ کے نعمتوں کی ناشکری کی تو ان کی بداعمالیوں کے سبب اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مثالی سوسائٹی وہ ہے:

(الف) جو امن والی ہو۔ مستحکم سیاسی نظام اور مضبوط حکومت کے سبب ہی سوسائٹی میں امن و امان قائم ہوتا ہے۔

(ب) اسی طرح مثالی معاشرے کی دوسری خصوصیت قرآن نے یہ بیان کی کہ وہ ایسا مطمئن معاشرہ ہو کہ اس کا رزق وافر مقدار میں اسے مہیا ہو۔ یعنی معاشی خوش حالی ہو۔ ہر فرد کی معاشی احتیاجات کی تسکین ہوتی ہو۔

(ج) اس آیت سے دو رکوع پہلے اللہ پاک نے عدل و انصاف کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس سے معاشروں کے بنیادی فکر اور نظریے کی وضاحت ہوتی ہے۔(23)

www.rahimia.org

سماجی زندگی کے ان تین بنیادی اساسی اصولوں کی روشنی میں معاصر مؤرخین اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریرات یہی بتلاتی ہیں کہ اس زمانے کا ہندوستانی معاشرہ علمی اور فکری حوالے سے عدل و انصاف کے بجائے انتشارِ فکر سے دوچار تھا۔ سیاسی عدمِ استحکام تھا۔ معاشی ناانصافی تھی۔

1۔علمی اور فکری انتشار کی حالت

یہ بات بڑی واضح ہے کہ سوسائٹی اسی وقت ترقی کرتی ہے کہ جب اس میں سوسائٹی کے سلگتے ہوئے مسائل کے حل کے لیے ایک مربوط قانونی اور فقہی نظام موجود ہو اور دوسرے یہ کہ ایسا قانونی نظام ایک جاندار اور مربوط فلسفہ وفکر پر استوار ہو۔ معاشرے ان دونوں کی ہم آہنگی کی اساس پر ترقی کرتے ہیں۔

اس وقت کے ہندوستانی معاشرے کے فکری انتشار کی حالت کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف فلسفے کے حوالے سے مختلف مکتبہ ہائے فکر منتشر افکار و خیالات پیش کر رہے تھے، جب کہ فقہی اور قانونی نظام کے حوالے سے مختلف فرقوں میں منتشر ذیلی فقہی جزئیات اور تخریجات اختیار کر کے مذہبی انتشار پیدا کیا ہوا تھا۔

(الف) فکر و فلسفے کے حوالے سے سوسائٹی کا انتشار

فلسفے کے حوالے سے ہندوستان کا یہ معاشرہ فلسفۂ یونان کے زیراثر تھا۔ اہلِ علم جانتے ہیں اس فلسفے کے ماننے والے دو گروہوں میں تقسیم ہیں؛ ایک مشّــائیـن، یعنی مادہ پرست: ان کے بہت سے لایعنی مزعومہ عقلی تخیلات معاشرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ فلسفے کا دوسرا سکول اشــراقیّین کا تھا، جو سوسائٹی میں اشراقی اور کشفی نقطہ نظر سے مسخ شدہ تصورات کا شکار تھا۔ انھیں کے زیراثر رہبان، مجذوب، غیرعلمی افراد، سوسائٹی میں جمود اور تنگ نظری پیدا کرنے والے موجود تھے۔ اس طرح جہاں فلسفۂ یونان کے ماننے والے مشّــائین مادی فلسفے کی اساس پر ایک دوسرے سے دست بہ گریبان تھے۔ اسی طرح اشــراقیّین کے زیراثر کشف و کرامات کے حوالے سے انتہا پسندانہ تشریحات نے ایک انتشارِ فکر پیدا کیا ہوا تھا۔ یوں دونوں طرف کے انتہا پسند طبقات لڑ رہے تھے۔

فلسفے کے یہ دونوں سکول، خواہ وہ کشف و کرامات کے حوالے سے ہوں یا مادیت پرستی یا عقل پرستی کی بنیاد پر ہوں، دونوں کئی ہزار سال پُرانے فلسفیوں کے خیالات کے اسیر تھے۔ ان کی حالت بہ قول امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ؛ قدیم یونانیوں کی بیان کردہ عقلیات کی پُرانی ہڈیوں کو سونگھنے اور چاٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔ شاہ صاحبؒ نے ان کے بارے میں بڑے سخت الفاظ کہے ہیں:

''تابعانِ فلاسفہ نزدیکِ من سگاں اند، بلکہ کم تر از سگاں، سگ استخوانِ کہنہ رابُو نمے کند، وایں ناکساں استخوانہا دو ہزار سال مے بویند و مے لیسند۔''(24)

(فلسفہ یونان کی اتباع کرنے والے میرے نزدیک کتے ہیں، بلکہ کتوں سے بھی کم تر ہیں۔ کتا پُرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتا، لیکن یہ ایسے لوگ ہیں کہ (فلسفے کی) دو ہزار سال پُرانی ہڈیوں کو سونگھتے ہیں اور چاٹتے ہیں۔)

(ب) جاہل صوفیا کا گمراہ کن کردار

شاہ صاحبؒ کے زمانے میں یہی حال جاہل صوفیا کا تھا۔ ایسے جاہل صوفیا علم دشمنی اور مذہب فروشی کا کردار ادا کر رہے

www.rahimia.org

تھے۔ انھوں نے روحانیت کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنایا ہوا تھا۔ ایسے جاہل صوفیوں کا دینِ اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ وہ گمراہی پھیلانے کا سبب بن رہے تھے۔ ان کے بارے میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''إنّ هٰؤلآء المتصوّفة الضّالّة المُضلّة فی زماننا هٰذا أشهد لِلّٰه باللّٰه و علیهم أنّهم فرقة نابتة فی الإسلام لیست من أصل الإسلام.'' (25)

(ہمارے اس زمانے کے یہ خودساختہ حاملین تصوف خود بھی گمراہ ہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ میں ان پر اللہ کی قسم اٹھا کر' اللہ کے لیے گواہی دیتا ہوں کہ یہ اسلام میں ایک ایسا نیا پیدا شدہ فرقہ ہے کہ جس کی دین اسلام میں کوئی اصل نہیں۔)

پھر اس پر ستم یہ کہ محققین صوفیا کی اصطلاحات ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' کی اصل حقیقت سمجھے بغیر ان کی انتہاپسندانہ تشریحات نے تصوف اور روحانیت کے نام پر لڑائی جھگڑے کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

(ج) فقہی جھگڑے اور علمِ شریعت سے انحراف

قانون اور اصولِ قانون کی تعلیم و تربیت سے انسانی معاشرہ ترقی کرتا ہے، جسے فقہ اور اصولِ فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فقہی اور قانونی تعلیم کے لیے درسِ نظامی پر مبنی تعلیمی نظام مُلّا نظام الدین سہالوی نے فرنگی محل لکھنؤ میں قائم کیا تھا۔ ان کے پیش نظر اس دور کی مسلمان ریاست کے قانونی اور عدالتی نظام کے لیے رجالِ کار تیار کرنا تھا، لیکن کوئی سو ڈیڑھ سو سال بعد شاہ صاحبؒ کے زمانے میں اس درسِ نظامی کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ اسے پڑھنے والے فقہی موشگافیوں اور حیلہ جوئیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ جس کو شاہ صاحبؒ ''استخراجی فقہ'' سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ محض فتویٰ بازی، جمود اور تنگ نظری کا علم بن کر رہ گیا۔ حنفی شافعی اختلاف تو اپنی جگہ پر تھے ہی، لیکن خود حنفیوں میں بھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے الفاظ میں کچھ ''ورّاقین'' یعنی ورق گردانی کرنے والوں نے انتشارِ فکر پیدا کیا ہوا تھا۔ اس سے دینی قانون، علم وفکر اور معاشرے کی یک جہتی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ علم بھی محض ایک رسم بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا مقصد سوائے باہمی مناظرہ بازی اور ایک حکومت قائم رکھنے یا دوسری حکومت کا آلہ کار رہنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ خواہ وہ حکومت کیسی ہی نااہل اور ظالم کیوں نہ ہو۔

ان کے بارے میں شاہ صاحبؒ نے ''التّفهیمات الإلٰهیه'' میں لکھا ہے کہ:

''أیُّها السُّفهاء المسمّون أنفسکم بالعلماء، اشتغلتم بعلوم الیونانیّین، و بالصّرف، و النّحو، و المعانی، و ظننتم أنّ هٰذا هوا العلم. إنّما العلم آیة محکمة من کتاب اللّٰه أن تتعلّموها .. أو سنّة قائمة من رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه و سلّم .. أو فریضة عادلة أن تتعلّموها.'' (26)

(اے بے وقوف اور نادان لوگو! تم نے اپنا نام ''علما'' رکھ لیا ہے۔ تم یونانی علوم، صرف ونحو (عربی کی گرائمر) اور علم معانی (فصاحت و بلاغت کے علم) میں مشغول ہو، اور سمجھتے ہو کہ بس یہی علم ہے۔ حقیقت میں علم، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی محکم آیات کا نام ہے، .. یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ سنت کا نام ہے، .. یا عدل وانصاف کے قائم کرنے کا فریضہ ہے کہ تم اس کی تعلیم حاصل کرو۔)

www.rahimia.org

شاہ صاحبؒ کے مطابق ''علما'' تو ہیں، لیکن وہ علم کو غلبہ دین کے مقاصد کے لیے یا شعائرِ دین کے غلبے کے لیے استعمال کرنے کے بجائے محض علم فروشی کا کام کرتے ہیں۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے ''التّفهيمات الإلٰهيه'' میں لکھا ہے کہ:

''أما ترون البلاد العظام تخلوا عن العلماء، و إن كانوا فهم دون ظهور الشّعائر.'' (27)

(کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ علاقوں کے علاقے علما سے خالی ہوگئے ہیں اور اگر کہیں علما ہیں بھی تو وہ دینی شعائر کے غلبے کی جدوجہد سے دور رہتے ہیں۔)

آپ دیکھیے کہ شاہ صاحبؒ نے یہ علمی اور فکری جائزہ لے کر فکری انتشار کے ذمہ دار جو مختلف مکاتب ہائے فکر ہیں، ان پر کڑی تنقید خود بھی کی۔ اس زمانے کے تمام مؤرخین بھی اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ''البدور البازغه'' کا پورا مقدمہ فلاسفہ یونان کے غلط مزعومات کی تردید میں ہے۔ اسی طریقے سے ''حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' کے مقدمے میں علما کے جو کم علمی پر مبنی مختلف تصورات ہیں، ان پر گفتگو ہے۔ ''التّفهيمات الإلٰهيه'' کی جلد اوّل تفہیم نمبر 69 میں شاہ صاحبؒ نے پوری تفصیل کے ساتھ علما، صوفیا، مشائخ، فوجیوں، حکمرانوں، امرا، تجار، صنعت کار، مزدوروں، کسانوں سے خطاب کرتے ہوئے اُن کی کمزوریاں واضح کی ہیں اور بتلایا ہے کہ کون کون سی خامیاں ان لوگوں کے اندر پیدا ہوچکی ہیں۔

2۔ سیاسی عدمِ استحکام کی حالت

شاہ صاحبؒ کے زمانے میں ایک طرف تو فکری اور دینی بحران کی یہ حالت ہے۔ کتاب وسنت ایک طرف رہ گیا۔ اور استخراجی فقہ اور اس کی اصولی مباحث میں پچھلے ہزار سال کی حیلہ جوئیوں کے استعمالات سے اس کی قانونی روح ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ فقہی قوانین جس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے، وہ ختم ہوکر رہ گیا۔ شاہ صاحبؒ نے ان امور کی نشان دہی کی۔

ایک تو یہ فکری انتشار موجود تھا۔ دوسرے سیاسی عدمِ استحکام تھا۔ اس دور میں ہندوستان کی سیاسی حالت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ خود شاہ صاحبؒ کے اس ساٹھ سالہ دورانیے میں کوئی دس سے زیادہ حکمران یکے بعد دیگرے بدل چکے تھے۔ جب کہ دنیا بھر میں جہاں بھی مستحکم حکومتیں قائم ہوتی ہیں، اُن کی پالیسیوں میں ایک تسلسل ہوتا ہے۔ اس پالیسی کے تسلسل کے تحت وہ فیصلہ سازی کرتی ہیں اور ملک ترقی کرتا ہے۔ پچاس سال اورنگزیب عالمگیر کی حکمرانی۔ شاہ جہان، جہانگیر اور اکبر کی حکمرانی کا بھی تقریباً چالیس چالیس پچاس پچاس سال کا دورانیہ ہے۔ اس طرح ہندستان میں کوئی دوسو سال تک ایک مستحکم سیاسی نظام مسلسل قائم رہا، لیکن شاہ صاحبؒ کے پچاس سال کے دورانیے میں دس حکمران یکے بعد دیگرے آتے رہے۔

سیاسی نظام کی خرابی کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ حکمران طبقات ذاتی عیش وعشرت میں مبتلا ہوکر قومی و اجتماعی معاملات میں قوت فیصلہ جیسی اہم طاقت سے محروم ہوگئے تھے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اما تا حال صبح مشورتے مے کنند، وشام آں را مے شکنند۔'' (28)

(حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ (حکمران) صبح کو ایک مشورہ طے کرتے ہیں اور شام کو اسے توڑ دیتے ہیں۔)

اس دور کے سیاسی حکمرانوں کی قوتِ فیصلہ نہ ہونے اور اس سیاسی کمزوری کا نتیجہ شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں یہ نکلا کہ:

''واز سلطنت بہ جُز نامے باقی نہ ماند۔''(29)

(نام کے سوا حکومت وسلطنت کا اَور کچھ باقی نہیں رہا۔)

غرض کہ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں ہندوستانی سماج، سیاسی طور پر تباہ و برباد ہو چکا تھا، اور شاہ صاحبؒ کو بڑی دل گرفتگی کے ساتھ یہ کہنا پڑا:　　''سلطنتِ دہلی منزلہ لعبہٴ صبیان گشت۔''(30)

(دہلی کی حکومت اور سلطنت بچوں کا کھیل بن کر رہ گئی ہے۔)

سیاسی عدمِ استحکام کے نتیجے میں بدامنی اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہی زمانہ ہے جس میں مختلف اطراف سے دہلی پر حملے ہوتے ہیں۔ نادر شاہ کا حملہ ہے۔ دوسرے لوگوں نے داخلی اختلاف وانتشار کی حالت میں قتل و غارت گری کی ہوئی ہے۔ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت ہے۔ مرکزی حکومت کا کمزور ہوجانا ہے۔ شاہ صاحبؒ اپنے ایک خط میں سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پورے ہندوستان کے تمام صوبوں کا ریونیو کم ہوگیا ہے۔ مرکزی حکومت کے پاس وسائل نہیں ہیں اور ان وسائل کے نہ ہونے کی وَجہ سے مستحکم نظام قائم کرنے سے عاجز ہے۔ غیر مستحکم نظام کا ایک مکمل نقشہ پیش کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''محصولاتِ ہندوستان کم از ہفت ہشت کروڑ نیست، لیکن بہ شرطِ غلبہ وشوکت۔ و اِلّا درہمے بہ دست نمے آید۔ چناں چہ الحال دیدہ مے شود۔''(31)

(ہندوستان کا ریونیو سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہے، لیکن یہ تب ہے کہ جب مستحکم اور مضبوط حکومت ہو۔ ورنہ تو ایک درہم بھی ہاتھ نہیں آتا، جیسا کہ اس وقت دیکھا جا رہا ہے۔)

3۔ عیاش حکمران اور معاشی عدمِ استحکام کی حالت

شاہ صاحبؒ کے زمانے میں حکمران عیاش ہوچکے تھے۔ ملکی خزانے پر بوجھ بن کر معاشیات کے بنیادی اساسی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ یہ عیاشی ان کے دل و دماغ میں راسخ ہو کر ایک مزمن مرض (chronic disease) کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس دور کے حکمران قیصر وکسریٰ سے کم نہیں تھے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ قیصر وکسریٰ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے زمانے کے حکمرانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"و ما تراه من ملوک بلادک يغنيک عن حکاياتهم، فدخل کلّ ذٰلک فی أصول معاشهم، و صار لا يخرج من قلوبهم إلاَّ أن تمزّع و تولّد من ذٰلک داء عضال، دخل فی جميع أعضاء المدينة." (32)

(عصر حاضر کے ملوک وسلاطین اور والیانِ ریاست کی عیاشیوں کو دیکھ کر تم ان (قیصر وکسریٰ) کی عیاشیوں اور زندگی کی لذات میں حد سے بڑھنے کا اندازہ لگا سکتے ہو، سرمایہ پرستی کے یہ تمام امراض ان کے اصولِ معاشیات میں داخل ہوچکے تھے۔ لوٹ کھسوٹ کا یہ طریقہ ان کے رَگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ جس کی وَجہ سے پورے تمدن اور معاشرے میں موجود تمام جماعتوں میں ایک لا علاج رَوگ پیدا ہوگیا تھا۔)

www.rahimia.org

اس طرح شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ آج کے زمانے کے ان حکمرانوں کو تم دیکھو تو قیصر و کسریٰ کو تم بھول جاؤ۔ وہی حالت ان کی ہے۔ ان میں سے ایک ایک امیر آدمی اپنی کمر کے گرد ایک پٹکا بھی باندھتا ہے تو وہ بھی کئی کئی لاکھ روپے کا ہے۔ اور اگر کسی عیاشی کی مجلس میں جاتے ہیں تو وہاں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں کہ میرے پاس کتنا قیمتی جبہ ہے، میرے پاس کتنا قیمتی پٹکا ہے، کتنی قیمتی بڑی کلاہ لگا رکھی ہے۔ اس پر مقابلے ہوتے ہیں، مناظرے ہوتے ہیں۔ اور پھر اس پر جھگڑتے ہیں۔

(الف) اقتصادی بدحالی کا سبب

شاہ صاحبؒ نے اپنے دور کی اقتصادی بدحالی کا بھی جائزہ لیا۔ حکمرانوں کے قومی خزانے پر ٹوٹ پڑنے سے عوام کی اقتصادی حالت بُری ہو رہی تھی۔ اس کے دو اسباب بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ ''**حُجَّة اللّٰه البالغه**'' میں تحریر فرماتے ہیں:

"و غالب سبب خراب البُلدان في هذا الزّمان شيئان: أحدهما تضييقهم علیٰ بيت المال، بأن يعتادوا التّكسّب بالأخذ منهم علیٰ أنّهم من الغُزاة، أو من العلماء الّذين لهم حقّ فيه، أو من الّذين جرت عادت الملوك بصلتهم، كالزّهّاد و الشّعراء، أو بوجه من وجوه التّكدّي، و يكون العمدة عندهم هو التّكسّب، دون القيام بالمصلحة، فيدخل قوم علیٰ قوم فينغصون عليهم و يصيرون كلًّا علیٰ المدينة.'' (33)

(اس زمانے میں ملکوں کی خرابی کے دو بنیادی اسباب ہیں:
ایک بڑا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے قومی خزانے کو مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے لوٹنا شروع کر دیا ہے، اور اس ذاتی مفاد پرستی پر مبنی لوٹ کھسوٹ کو ہی اپنی کمائی کا دھندہ بنالیا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو غازی اور مجاہد بن کر اسے لوٹ رہے ہیں۔ بعض علما ہیں جو اپنے علم کی وَجہ سے اپنے آپ کو قومی خزانے کا مستحق سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو حکمران طبقات سے بخشش اور انعام و اِکرام کے طلب گار رہتے ہیں، جیسے نام نہاد صوفی، شاعر اور ادیب لوگ ہیں۔ اور باقی لوگ بھی لوٹ کھسوٹ کے مختلف حیلوں بہانوں سے قومی خزانے کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ ان میں ذاتی مفادات اتنے غالب آ چکے ہیں کہ انھوں نے اسی لوٹ کھسوٹ کو اپنی کمائی کا پیشہ بنایا ہوا ہے۔ اور وہ اسے بہت اچھا کام سمجھتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ قومی اور اجتماعی مصلحتیں پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟ ذاتی مفاد پرستی کا عالم یہ ہو گیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور پھر وہ ایک دوسرے کے لیے تنگی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تمام لوگ سوسائٹی اور ملک پر بوجھ بن چکے ہیں۔)

شاہ صاحب نے واضح کیا کہ بیت المال پر تمام لوگوں کا جھپٹنا، اس کے وسائل کو لوٹنا اور اس لوٹ کھسوٹ میں تمام تر افراد کا شامل ہونا معاشی عدمِ استحکام کا سبب بن گیا۔ شاہ صاحبؒ نے لکھا کہ جو فوجی اور اُمرا ہیں، وہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم نے ملک کی خدمت سرانجام دی ہے، اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ پیسے ملنے چاہئیں۔ علما ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو علم دے رہے ہیں، اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ بیت المال سے پیسے ملنے چاہئیں۔ شعرا اور اُدبا ہیں، وہ اس بیت المال پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظریں اس پر ہیں۔ واعظین ہیں تو وہ اپنے وعظ کا وظیفہ بھی خلیفہ اور حکومت سے لینا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اور تو اَور

www.rahimia.org

وہ فقرا اور زُہاد یا صوفیا جو زہد وتقویٰ کی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا معاوضہ ہمیں حکومت سے ملے۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ عجیب بات ہے کہ بیت المال ہے، جو قومی نظام چلانے کے لیے، ملکی نظم ونسق کی عمومی اسلامی مصلحت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے یا یہ کہ خزانہ اُجاڑنے کے لیے ہے کہ ہر آدمی اُس پر بوجھ ہے۔

شاہ صاحبؒ نے آخر میں ایک جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ: ''و یصیرون کلاًّ علیٰ المدینة.'' (یہ سب اس سوسائٹی پر بوجھ بن چکے ہیں۔) اور پھر اس چھینا جھپٹی میں ہر ہر طبقے کا جہاں داؤ لگتا ہے، وہاں داؤ لگاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں آپس میں لڑتے ہیں۔ ایک دوسرے پر فتوے لگاتے ہیں۔ کافر بناتے ہیں۔ مال و دولت کی لڑائی جھگڑے کے سبب ایک دوسرے کی عزتیں اُچھالتے ہیں۔ یہاں تک کہ سارے ہی لوگ حکومت کے خزانے کے سامنے دریوزہ گر اور بھیک مانگنے والے بن گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک اَور جملے پر غور کیا جائے کہ:

''و یکون العمدة عندهم هو التّکسّب، دون القیام بالمصلحة.''

ان کے نزدیک عمدہ ترین بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے حکومت سے مال لوٹا جائے۔ ملک کی اصلاح اور سوسائٹی کی ترقی کا قائم کرنا ان کا مقصد اور ہدف نہیں ہے۔ یہی ان کا پیشہ ہے۔ اس طرح اس زمانے میں دو طبقات پیدا ہوگئے۔ معاشرے میں طبقاتی نظام وجود میں آ گیا۔ جن کا ہاتھ پڑتا ہے اور طاقت ور ہیں وہ تو اس بیت المال یا حکومت کے خزانے یا قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر سب سے آگے ہیں۔ اور اس طرح امیر سے امیر تر بنتے جا رہے ہیں۔ جس بے چارے کا ہاتھ نہیں پڑتا، وہ غریب اور غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس طبقاتی نظام میں دونوں طبقے دو مختلف حالتوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک طبقہ قیصر روم اور کسریٰ کی طرح عیاشیوں کے سبب بے راہ روی کا شکار تھا۔

(ب) اقتصادی بدحالی کا دوسرا سبب؛ ظالمانہ ٹیکس

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ کسی قوم میں اگر سبھی لوگ وسائل کو لوٹنے لگ جائیں تو اتنے وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اس کے نتیجے میں ایک دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ غریبوں؛ کاشت کاروں، دست کاروں اور تاجروں یعنی کام کرنے والے محنت کشوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جا رہے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے بیان کیا کہ اصولِ مکاسب (بنیادی پیشے)؛ زراعت، تجارت اور صنعت ہیں۔ معاشیات کے ان تین بنیادی شعبوں میں کام کرنے والے جب یہ ظالمانہ ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تو وہ مجبور ہو کر دو میں سے کوئی ایک راستہ اپناتے ہیں: ایک یہ کہ وہ ردِّعمل میں تشدد پسند بنیں اور حکمران طبقہ اُن کے قتل کے درپے ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مجبوراً وہ ظالمانہ ٹیکس دیتے رہیں تو اُن کی کارکردگی پر فرق پڑتا ہے اور وہ غریب سے غریب تر بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح قومی ریونیو مسلسل کم ہوتا جائے گا۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں میں کئی مقامات پر اس کا واضح نقشہ کھینچا ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''أنّ تلک الأشیاء لم تکن لتحصل إلاَّ ببذل أموال خطیرة، و لا تحصل تلک الأموال إلاَّ بتضعیف الضّرائب علیٰ الفلاَّحین، و التُّجّار و أشباههم، و التّضییق علیهم. فإن امتنعوا قاتلوهم، و عذّبوهم، و إن أطاعوا جعلوهم بمنزلة الحمیر و البقر یُستعمل فی النّضح، و الدِّیاس، و الحصاد، و لا تقتنیٰ إلاَّ لِیُستعان بها فی الحاجات. (34)

(اس لیے کہ عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی، اس کا حصول بہت سی دولت خرچ کیے بغیر ناممکن تھا۔ اس لیے ان ملوک و سلاطین نے محنت کش طبقات یعنی کسانوں اور تاجروں وغیرہ پر بھاری ٹیکس لگادیے۔ اگر وہ ٹیکس دینے سے انکار کرتے تو ان کو مارا پیٹا جاتا اور سخت عذاب دیا جاتا۔ اس طرح ان کے سامنے دوسرا راستہ ہی رہ گیا کہ وہ سلاطین اور سرمایہ داروں کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں۔ چوپایوں اور گدھوں کی سی ذلیل زندگی بسر کریں۔ جن سے ان کی مرضی کے بغیر ہل چلانے اور کنویں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جن کی تھوڑی بہت پرورش یا غور و پرداخت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ مالکوں کی اپنی اغراض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔)

(معیشت کے حوالے سے مزید گفتگو ''شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت'' کے عنوان سے ہونے والے لیکچر میں ہوگی۔)

معاشی بدحالی کی وَجہ سے دین سے دوری

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ جو عیاش طبقہ مال و دولت اکٹھا کرتا ہے اور امیر سے امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے، یوں وہ دین سے دور ہوجاتا ہے۔ دین پر عمل کرے گا تو اسے ساری لوٹ کھسوٹ، جھوٹ اور بددیانتی کا ارتکاب چھوڑنا پڑے گا۔ اُن کی عیاشیوں میں فرق آئے گا۔ اس طرح وہ دین کا انکار کردیتے ہیں۔ وہ اپنے ہی جاری کردہ طریقۂ کار کو اصل سمجھتے ہیں۔ یہ طبقہ اُسی کو دین کے نام سے مسلط کرتا ہے۔ اب جس عالم نے لوٹ کھسوٹ کرنی ہے، جس شاعر اور ادیب نے یہ کام کرنا ہے، جس حاکم وقت یا فوجی حکمران نے یہ ظلم و ستم کا کام کرنا ہے، وہ بھلا دین کے اساسی اصولوں اور اس کی اَخلاقیات پر عمل کیوں کرے گا؟ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''فلما كثُرت هٰذهِ الأشغال تشبّح فى نفوس النّاس هيآت خسيسة، و أعرضوا عن الأخلاق الصّالحة.'' (35)

(جب کسی معاشرے میں اس طرح کے کام کثرت سے ہونے لگیں تو پھر انسانوں میں ذلیل خصلتیں جڑ پکڑ جاتی ہیں۔ اور وہ اعلیٰ اور عمدہ اخلاق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔)

آگے چل کر عیاش حکمران طبقوں کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''خاضوا فى لذّة الدّنيا، و نسوا الدّار الآخرة، و استحوذ عليهم الشّيطان، تعمّقوا فى مرافق المعيشة و تبا هوا بها.'' (36)

(یہ مقتدر طبقات و سرمایہ پرست لوگ دنیا کی لذتوں میں ڈوب گئے۔ اور آخرت کو بھول گئے۔ شیطان نے ان پر اپنا تسلط جمالیا۔ یہ لوگ اپنی دنیوی زندگی کی عیاشیوں میں غرق ہوگئے۔ اور اس پر فخر کرنے لگے۔)

اسی طریقے سے شاہ صاحبؒ نے دوسرے مظلوم طبقے کے لوگوں کی مثال دی ہے کہ جو جانوروں کی سطح پر رہ کر، گدھوں اور بیلوں کی طرح کام کرنے میں جُتے رہتے ہیں۔ ایسے مزدور، کاشت کار یا ایسے ہی پیشوں سے وابستہ لوگ کہ جو سارا سارا دن کام کرنے کے باوجود بھی اُن کی معاشی حالت درست نہیں ہوتی، انھیں ٹیکس دینے کے لیے مجبوراً کام کرنا پڑتا ہے، تو وہ جانوروں کی

طرح ہونے کی وَجہ سے سعادتِ اُخروی اور دینی اصولوں پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"ثمّ لا تترک ساعۃ من العناء حتّیٰ صاروا لا یرفعون رؤسھم إلیٰ السّعادۃ الاُخرویۃ أصلاً، و لا یستطیعون ذٰلک." (37)

(پھر اُن کو محنت اور مشقت سے ایک گھڑی بھی آرام کا موقع نہیں دیا جاتا، یہاں تک کہ یہ لوگ سعادتِ اُخرویہ کی طرف بالکل توجہ نہیں دے پاتے اور نہ ہی یہ اس قابل رہتے ہیں۔)

شاہ صاحبؒ نے عملی بات کی کہ جب کسی مزدور اور محنت کش کے سامنے آپ بات کریں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، عبادات کرو، آخرت کا فکر کرو، لیکن چوبیس گھنٹے میں اس کے پاس ایسا وقت ہی نہیں بچتا کہ جس میں وہ یہ کام کر سکے۔ تو وہ کیسے عبادات کی طرف متوجہ ہوگا؟

ایسی صورتِ حال میں شاہ صاحبؒ نے کہا کہ یہ دونوں طبقے دین سے عاری ہو جاتے ہیں۔ ایک مجبوری سے اور ایک عیاشی کی وَجہ سے دین سے دور ہو جاتا ہے۔ طبقاتی تقسیم کے اس ظالمانہ کردار کی وَجہ سے معاشرے کا ہر فرد، دین سے دور ہو جاتا ہے، اور یوں پورا معاشرہ دین بیزاری کی لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ شاہ صاحب کے الفاظ میں:

"و رُبما کان إقلیم واسع لیس فیھم أحد یھمُّہ دینہ." (38)

(بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بڑے ملک میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہوتا کہ جو اپنے دین کی فکر کرے۔)

غیرملکی دشمن طاقتوں کے تسلط پر شاہ صاحبؒ کی نظر

شاہ صاحبؒ نے ایک اَور حقیقت واضح کی کہ نہ صرف یہ کہ اُس سوسائٹی میں افتراق و انتشار اور مختلف فرقے اور گروہ بن گئے تھے، بلکہ اسی کے ساتھ مرہٹوں کی طاقت الگ اُبھر رہی ہے، جو سوسائٹی میں مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ انسانیت دشمنی کا کام کر رہی تھی۔ خود انسانیت کے علَم بردار مسلمان اگر اس لوٹ کھسوٹ میں شریک ہو گئے تو جو باقی مذاہب، جن میں انسانی اقدار کا کوئی تصور نہیں ہے، تو وہ لوٹ کھسوٹ میں ان سے بھی آگے بڑھے۔ مرہٹوں کی ظالمانہ کارروائیاں تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں کہ انھوں نے خود ہندوؤں کی لوٹ کھسوٹ کے لیے بھی کیسا ظالمانہ کردار ادا کیا۔

اسی طرح شاہ صاحبؒ کی نظر غیرملکی دشمن طاقتوں کے تسلط پر بھی ہے۔ انھیں صاف طور پر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ایک طرف ملک کا فکری، سیاسی، معاشی اور سماجی نظام دگرگوں حالت میں ہے تو دوسری طرف غیرملکی سامراج، آہستہ آہستہ پورے ملک کو اپنے ظالمانہ شکنجے میں جکڑ رہا ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ مکہ مکرمہ سے لکھے گئے اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''احوالِ مردم ہند، بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشاءِ فقیر است۔ بلادِ عرب نیز دیدم۔ و احوالِ مردم ولایتِ افرنگ از ثقات ایں جا شنیدم۔''(39)

(ہندوستان کا حال ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ فقیر (شاہ صاحبؒ) کا وطن ہے۔ عرب ممالک کو بھی دیکھا ہے اور انگلستان کے لوگوں کے حالات بھی، ثقہ آدمیوں سے اس جگہ (مکہ مکرمہ) سنے ہیں۔)

اس سے شاہ صاحبؒ کی دور بین نگاہ کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر آپؒ کی گہری نظر

www.rahimia.org

تھی۔ اس طرح انگریزوں کی اُبھرتی ہوئی طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں بنگال پر حملہ آور ہو رہی تھی، شاہ صاحبؒ کی نظر میں وہ بھی ہے۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ بنگال جیسے مال دار سرحدی صوبے --- جس کا ریونیو مغل دورِ حکومت میں بہت زیادہ تھا --- پر حکمرانی کی اہلیت نہ رکھنے والے ایک کم عقل نوجوان سراج الدولہ کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ وہ ان تمام سازشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''در عہدِ محمد شاہ ہر سال از بنگالہ یک کروڑ مقرر بود، و ہمیشہ صوبہ دار آں جا بلا توقف مے فرستاد، با وصف ادائے ایں مبلغ، مال دار ترین امرائے ہندوستان صوبہ دار بنگالہ بود۔ چناں چہ با وجود بے نسقے دریں ایام ہم سفیہے کار نادیدہ نوجوانے (سراج الدولہ) کہ مسلط است بر بنگالہ۔ وآں نبیرۂ ناظمِ قدیم (نواب علی وردی خاں) آں جا است۔ صاحبِ خزائن بے شمار است۔''(40)

(عہدِ محمد شاہ میں بنگال سے ہر سال ایک کروڑ کا ریونیو آتا تھا۔ اور وہاں کا صوبے دار ہمیشہ بروقت اسے بھیجتا رہتا تھا۔ اتنی رقم کی ادائیگی کے باوجود بنگال کا صوبے دار ہندوستان کے امرا میں انتہائی مال دار اور امیر تھا۔ چناں چہ اس وقت جب کہ بنگال میں بدنظمی ہے، وہاں ایک کم عقل ناواقفِ کار نوجوان یعنی قدیم ناظم (نواب علی وردی خاں) کا نواسہ مسلط ہے۔ وہ نوجوان بے شمار خزانوں کا مالک ہے۔)

شاہ صاحبؒ کی بات تاریخ نے ثابت کر دی کہ شاہ صاحبؒ کی زندگی میں ہی 1757ء میں سراج الدولہ کی کم عقلی اور حکمرانی امور سے ناواقفیت کے سبب اس کو شکست ہوتی ہے اور بنگال انگریزوں کی جھولی میں جا گرتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے زمانے میں ہندوستان میں داخلی انتشار جس میں فکری، سیاسی اور معاشی حالت کی خرابی ہی کیا کم مصیبت تھی کہ باہر سے حملہ آور انگریزوں نے ہندوستان کا اہم ترین مالیاتی ترقی یافتہ صوبہ بھی چھین کر اپنے قبضے میں لے لیا۔ جب شاہ صاحبؒ کا 1762ء میں وصال ہوتا ہے تو بنگال، بہار اور اُڑیسہ تین صوبوں کی دیوانی اور مالیاتی نظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس چلا جاتا ہے۔

شاہ صاحب کے اس ساٹھ سالہ عہد کا یہ وہ منظر نامہ ہے، ایسے حالات میں شاہ صاحبؒ نے اپنے فکر و عمل کو مرتب کیا۔ شاہ صاحبؒ کے فکر و عمل کی ترتیب میں، اس منظر نامے کا بڑا دخل ہے۔ اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

علمی تحقیق و تجدید کا ولی اللّٰہی منہج

کسی سوسائٹی میں فکری انتشار اور علمی اختلافات معاشرے کے سیاسی استحکام اور معاشی اضمحلال کا باعث بن رہے ہوں تو سب سے پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ علم و شعور کے محققانہ انداز و اُسلوب کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اس لیے کہ کسی بھی سوسائٹی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ جہاں سے فکر و عمل کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں، انھیں مہذب اور مرتب بنایا جائے، تاکہ اہلِ علم کا نظریہ و فکر اور علم و شعور درست ہو۔ اس لیے سب سے پہلے شاہ صاحبؒ نے علمی طور پر دین کا ایک مستحکم علمی مربوط نظام مرتب کیا۔ انھوں نے بارہ سال تک تمام علوم کی بڑی تحقیق اور غور و خوض کے ساتھ تدریس کی تھی۔ حرمین شریفین کے علما سے علومِ نبوت کا فیضان حاصل کیا تھا۔ خاص طور پر مدینہ منورہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوضات و برکات سے مستفیض ہوئے تھے۔ اس کی روشنی میں انھوں نے اپنا علمی منہج اور فکری اُسلوب متعین کیا۔

www.rahimia.org

تحقیق وتجدید کے لیے علم تطبیق الآرا کی دریافت

اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''علم تطبیق الآرا'' دریافت کیا اور اُسے تمام علوم وافکار اور اعمال واَخلاق کی تفہیم کے لیے علمی اورفنی طور پر استعمال کیا۔ اس علم کی حقیقت و ماہیت یہ ہے کہ سب سے پہلے مختلف علوم وفنون اور اعمال واَخلاق کے بنیادی حقائق اور امورِ واقعیہ کا تعین کیا جائے اور پھر اُس شعبۂ علم سے متعلق موجود ''امرِ واقعی'' کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف علمی آرا کا تحقیق و تجزیہ کیا جائے۔ جو رائے ''امرِ واقعی'' کے عین مطابق یا اُس کے قریب تر ہو، اُسے قبول کیا جائے اور جو رائے اُس کے عین مخالف یا بعید تر ہو، اس کی اس قرار واقعی حیثیت کا تعین کیا جائے۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک علم کے تین ذرائع؛ عقل، نقل اور کشف ہیں۔ انھیں تینوں ذرائع کو بروئے کار لاکر ہر شعبۂ علم سے متعلق ''امرِ واقعی'' کا تعین کیا جانا ضروری ہے۔ اور پھر پیش آمدہ آرا کے اختلاف کو اسی تناظر میں حل کیا جائے۔ علم تطبیق الآرا کے حوالے سے خود امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"إعلموا إخواني ـــ رحمكم اللّٰه! ـــ أنّ لكلّ زمانٍ قرناً، و لكلّ قرنٍ علماً، أصابهم في تقاسيم رحمة اللّٰه عزّ و جلّ. و إن تأمّلتم حال أوائل هٰذه الأمّة المرحومة، حين لم تدوّن علوم الشّرع و لا فنون الأدب، و لا وقع عنها كثير بحثٍ، و أنّهٗ لم يزل إلهام الحقّ يبرز في صدورهم علماً بعد علمٍ، علٰى حسب حكمتهٖ في كلّ دورةٍ لم يخف عليكم هٰذا المعنٰى.

و أنّ نصيبنا في هٰذه الدّورة من تقاسيم رحمة اللّٰه أن يجتمع في صدورنا علوم علماء هٰذهٖ الأمّة؛ معقولُها، و منقولُها، و مكشوفُها، و ينطبق بعضها علٰى بعض، و يضمحلّ الخلاف بينها، و يستقرّ كلّ قولٍ في مقرّهٖ. فهٰذا الأصل منسحب علٰى فنون العلم من الفقه، و الكلام، و التّصوّف، و غيرها بحمد اللّٰه و توفيقهٖ." (41)

(اے میرے بھائیو! ـــ اللہ تم پر رحم کرے ـــ یہ بات جان لو کہ بے شک ہر زمانے اور ہر صدی کا ایک علم ہوتا ہے، جو اللہ عز وجل کی رحمت سے لوگوں تک پہنچتا ہے۔ اگر تم اس اُمتِ محمدؐیہ ـــ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کرے ـــ کے شروع زمانے کے حالات پر غور وفکر کرو، جب کہ ابھی شرعی علوم اور ادبی فنون مدوّن نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ان سے متعلق بہت زیادہ بحث اور تحقیق وتفتیش ہوتی تھی۔ اس وقت ہر دور کی حکمت کے مطابق علما کے سینوں میں حق تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ہمیشہ ایک علم کے بعد دوسرے علم کا الہام ہوتا رہا ہے۔ تو تم پر یہ بات مخفی نہیں رہے گی۔

اس دور میں اللہ کی رحمت سے تقسیم ہونے والے علوم کے حوالے سے ہمارا حصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سینے میں اس اُمت کے علما کے تمام علوم، خواہ وہ معقول ہوں یا منقول اور مکشوف، جمع کر دیے ہیں۔ ان علوم کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے، ان کے باہمی اختلاف کو حل کرنے اور ہر ایک قول کو اپنے اصل مقام پر رکھنے کا علم عنایت کیا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جسے تمام علمی فنون؛ علمِ فقہ، علمِ کلام، علمِ تصوف وغیرہ میں جاری کرنے کی بحمد اللہ توفیق ہوئی ہے۔)

www.rahimia.org

شاہ صاحبؒ نے اس علمِ تطبیق الآرا کی روشنی میں عقل، نقل اور کشف کے تناظر میں حکمتِ عملیہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر شعبۂ علم کے بنیادی حقائق اور واقعی امور کا تعین کیا اور پھر اُس کی روشنی میں ایک مربوط علمی اور فکری مؤقف اختیار کیا۔ شاہ صاحبؒ نے اس علمِ تطبیق الآرا کے ذریعے سے متعین کردہ اصول کی روشنی میں علوم القرآن، علومِ حدیث، علومِ فقہ، علومِ تصوف، علومِ تاریخ، علمِ فلسفہ، علمِ کلام وغیرہ سے متعلق علما کے اختلافِ فکر و عمل کو حل کرنے اور وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں بیان کردہ تمام علوم وفنون میں اس علمِ تطبیق الآرا کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس علم کے نتیجے میں شاہ صاحبؒ نے درجِ ذیل دو بنیادی طریقہ ہائے علم وفکر متعین کیے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کام کے دو دائرے

اس طرح شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کام کے دو بنیادی دائرے بنتے ہیں:

1۔ **الجادة القويمة المحمّدية**: شریعتِ محمدیہ کے حوالے سے وجود میں آنے والے فرقوں اور گروہوں کی اختلافی آرا کو حل کرنے کے لیے شریعتِ محمدیہ کے اصل اور قرار واقعی جادۂ قویمہ کا تعین کرنا۔

2۔ **علمِ اَسرارِ دین**: دینِ اسلام اور دیگر تمام مذاہبِ عالم کے درمیان انسانی سماج کی تشکیل سے متعلق ہونے والے اختلافی امور کے حل کے لیے علمِ اَسرارِ دین کی اساس پر مسلمہ قواعد وضوابط کا تعین کرنا۔

1۔ شریعتِ محمدیہ کی تفہیم کا سیدھا اور درست راستہ

شاہ صاحبؒ نے علمِ تطبیق الآرا کے اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ شریعتِ محمدیہ کے امورِ واقعی کا تعین کرتے ہوئے ''**الجادّة القويمة من الشّريعة المحمّدية**'' (محمدی شریعت کی درست شاہراہِ فکر و عمل) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کو شاہ صاحبؒ نے بار بار اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ کہیں مختصر ''**الجادّة القويمة**'' لفظ استعمال کیا ہے اور کہیں اس کے ساتھ ''**من الشّريعة المحمّديه**'' یا ''**المصطفويه**'' وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے ان کی کتاب ''**فيوض الحرمين**'' میں نظر آتی ہے۔ پھر ''**التّفهيمات الإلٰهيه**'' میں شاہ صاحبؒ نے اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ علمِ تطبیق الآرا کی روشنی میں جادۂ قویمہ کا تعین ولی اللّٰہی تحقیق وتجدید میں بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح شاہ صاحبؒ نے شریعتِ اسلامیہ کی تفہیم کے لیے علمی اور فکری بنیادیں مضبوط بنائیں اور اس حوالے سے باقاعدہ قرآن وحدیث، فقہ اور تصوف کی تفہیم کے بنیادی اساسی علوم کی تلخیص کی اور انھیں مرتب اور مدوّن کیا۔ محض نظریات وافکار بیان کرنا کافی نہیں ہے۔ علمی طور پر اور سائنٹفک طور پر علوم کو مرتب اور مدوّن کرکے اصلِ علم اور اس کی تفہیم کا صحیح طریقہ اور فلسفہ مرتب کرنا بھی بنیادی کام ہے جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کیا ہے۔

2۔ علمِ اَسرارِ دین کی اساس پر فلسفہ مذاہبِ عالم کا تعین

شاہ صاحب کا دوسرا بنیادی کام یہ ہے کہ انھوں نے علمِ تطبیق الآرا کی روشنی میں قرآن حکیم کے نزول کے وقت انسانیت کے تمام مذاہب اور فلسفہ ہائے فکر کے مسلمہ قواعد وضوابط مرتب اور مدوّن کیے۔ یوں انسانی سماج کی درست تشکیل کے لیے ایک مکمل

www.rahimia.org

فلسفۂ فکر مرتب کیا، جس کو انھوں نے ''علم اسرارِ دین'' کا عنوان دیا۔ اسے آپ ''فلسفة التّشریع الإسلامی'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس علم میں انھوں نے ایک مکمل فلسفۂ فکر و عمل مرتب اور مدوّن کیا، جس میں سوسائٹی کی تشکیل کے بنیادی فکر اور علمی نظریے سے متعلق مسلمہ قواعد بھی بیان کیے اور سیاسی اصول اور معاشی اصول اور ضابطے بھی مرتب کیے۔ اس طرح انھوں نے سماج کی تشکیل اور ارتقا کا پورا عمرانی ڈھانچہ بیان کیا، جسے شاہ صاحبؒ انسانیت کے بنیادی ''اَخلاقِ اربعہ'' اور ''ارتفاقاتِ اربعہ'' کا عنوان دیتے ہیں۔

اب ہم شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کام کے ان دونوں دائروں سے متعلق مرحلہ وار گفتگو کریں گے۔ ہمیں اگر علم کی اساس پر وحدتِ فکر پیدا کرنا ہے تو اس کے لیے ہمیں ایک واضح راستہ اختیار کرنا ہے۔ اس راستے کے بنیادی اساسی اصول ہیں۔ دینی علوم کی ترتیب و تدوین کے حوالے سے شاہ صاحبؒ نے جو علمی طریقۂ کار اور منہج اختیار کیا ہے، اسے سمجھنا ہے۔

''الجادّة القویمة من الشّریعة المحمّدیه'' (شریعتِ محمدیہ کی صحیح علمی شاہراہِ فکر و عمل)

دیکھیے! منبع علم ذاتِ نبوت ہے۔ اور ذاتِ نبوت حضور اقدسؐ پر اللہ کا جو قانون اور ضابطہ آیا ہے، اس کے ہمارے پاس علمی طور پر پہنچنے کے چار بنیادی منابع ترتیب وار ہیں، جن کے ذریعے سے علومِ نبوت اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ علم کا اگر دعویٰ کیا جائے تو وہ دین کا علم نہیں ہے، وہ کسی کی ذاتی اور شاذ رائے ہوسکتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے دینِ اسلام کے جادۂ قویمہ کا تعین کرتے ہوئے سب سے پہلے کتابِ مقدس قرآن حکیم کی نصوص سے حاصل شدہ علم کو امرِ واقعی قرار دیا۔ اس کے بعد احادیثِ مستفیضہ صحیحہ یعنی صحیح اور مشہور احادیث کو قرار دیا۔ تیسرے درجے پر کبار صحابہؓ اور تابعین کے مذہب کو قرار دیا۔ چوتھا درجہ اُن احادیثِ مبارکہ کا ہے، جو فقہا کے نزدیک صحیح یا حسن ہیں۔ ان چار امورِ واقعیہ سے ثابت شدہ دین ظاہر شریعتِ محمدیہ ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''للشّریعة المطهّرة ظاهرٌ و شاذٌّ. و ظاهر الشّریعة المصطفویة لهٗ مراتب:

(۱) فأقواها: ما وُجد فی نصّ القرآن العظیم منطوقاً بهٖ بحیث لایخفیٰ المراد منهٗ علیٰ العارف باللّسان.

(۲) ''و یتلوهٗ: ما نطق بهٖ الأحادیث المستفیضة الصّحیحة...

(۳) و یتلوهٗ ما حکاهٗ مالکؒ فی المؤطّا: ''أنّهٗ مذهب کبار الصّحابةؓ و التّابعینؒ و الّذی جریٰ علیه عمل أهل المدینة من لّدن زمان النبوة إلیٰ زمانهٖ'' ...و فی حکم ما حکاهٗ مالکؒ کذلک ممّا کان مثلهٗ ممّا یرویهٖ سفیان الثّوریؒ مثلاً.

(۴) و یتلوهٗ: ما صحّ فیهٖ حدیثٌ صحیحٌ أو حسن فی الکتب المشهورة و قام بمثلهٖ الحجّة، و أخذ بهٖ جماعة من الفقهاء. أو کان استنباطاً صحیحاً قویاً شهد لهٗ الجماعة بالصّحّیة. و اللّٰه أعلم. فهٰذا کلّهٗ ظاهر شریعة النّبیّ ﷺ و الجادّة القویمة من سننهٖ البیّن رُشدُها و الباهرُ قدرُها.''(42)

(شریعتِ مطہرہ کا ایک ظاہر ہے اور ایک شاذ ہے۔ اور شریعتِ مصطفویہ کے ظاہر کے چند مراتب ہیں:

1۔ ان میں سب سے مضبوط قرآن حکیم کی ایسی نص ہے کہ کلام اسی معنی اور مطلب کے لیے چلائی گئی ہو۔ اہل زبان کے لیے اُس کی مراد اور مفہوم مخفی نہ ہو۔

www.rahimia.org

2۔ اس کے بعد وہ علم ہے جو صحیح اور مستفیض احادیث سے معلوم ہوا ہو۔

3۔ اس کے بعد ان کبار صحابہؓ اور تابعینؒ کا مذہب ہے، جسے امام مالکؒ نے مؤطا میں بیان کیا ہے اور اس پر اہل مدینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر امام مالکؒ کے زمانے تک عمل کرتے رہے۔ اور اسی کے حکم میں وہ ہے جسے (کوفہ میں) مثلاً امام سفیان ثوریؒ وغیرہ نے صحابہؓ کے علم کے طور پر روایت کیا ہے۔

4۔ اس کے بعد:

(الف) وہ علم ہے، جو کتبِ مشہورہ میں روایت شدہ صحیح یا حسن حدیث سے ثابت ہے۔ ایسی حدیث کہ جس کی بنیاد پر حجت قائم کی جا سکے۔ اس حدیث کو فقہا کی ایک جماعت نے لیا ہے۔

(ب) یا وہ علم ہے کہ جو صحیح اور مضبوط استنباط کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور اس کے صحیح ہونے پر ایک جماعت گواہی دے۔

ان چار مراتب سے ثابت شدہ علم نبی اکرمؐ کی شریعت کا ظاہر ہے۔ یہی آپؐ سے ثابت شدہ طریقۂ کار کا جادۂ قویمہ ہے، جس کا ہدایت پر ہونا بالکل واضح ہے۔ اور اس کی قدر و عظمت کا ہونا ظاہر و باہر ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے اس طریقے سے سمجھایا کہ علما جانتے ہیں کہ جب فقہ حنفی پر بحث کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فقہ حنفی کی کچھ **ظاهر الرّواية** ہے اور کچھ **نادر الرّواية** ہے۔ یہ فقہ شافعی کی **ظاهر الرّواية** ہے اور یہ **نادر الرّواية** ہے۔ چناں چہ حنفیوں کی **ظاهر الرّواية** میں کہا جاتا ہے کہ امام محمد کی چھ کتابیں (**الجامع الصغير، الجامع الكبير، السِّيَر الصّغير، السِّيَر الكبير، المبسوط (الأصل)** اور **الزيادات**) ہیں، جو اصولِ ستہ کہلاتی ہیں۔ امام شافعیؒ کی ظاہر الروایت وہ اقوال ہیں، جس پر امام رافعیؒ اور امام نوویؒ متفق ہیں، وہ **ظاهر الرّواية** کہلائیں گی۔ ایسے ہی امام مالک کی **ظاهر الرّواية** وہ جو ''**المدوّنه**'' میں مرتب ہو چکی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ شاہ صاحبؒ نے اسی تناظر میں سمجھایا کہ شریعتِ محمدیہ کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک نادر ہے۔ **ظاهر الرّواية** جو ہوگی، وہ ان چار امورِ واقعیہ کے ذریعے سے سامنے آئے گی۔ اس کے علاوہ جو بھی ہے، وہ **نادر الرّواية** ہے۔

اس جادۂ قویمہ کی روشنی میں ضروری ہے کہ منطوقِ قرآن سے متعلق علوم، مشہور اور مستفیض احادیث کا علم، فقہائے اُمت کے تعامل کا صحیح فہم اور اخبارِ احاد پر مشتمل احادیثِ نبوؐیہ سے متعلق علوم کے معیارات متعین کیے جائیں۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے علوم القرآن سے متعلق ''**الفوز الكبير**''، ''**تاويل الأحاديث**''، ''**فتح الرّحمٰن**'' وغیرہ کتابیں لکھیں۔ احادیث کے علم کی محققانہ تفہیم کے لیے کتبِ حدیث کے طبقات متعین کیے۔ اہلِ مدینہ اور اہلِ کوفہ کے تعامل اور فقہائے اُمت کی فقہی آرا کے تناظر میں شریعتِ محمدیہ کے تعین کے لیے ''**المسوّٰی**'' لکھی۔ پھر ''**حجّة الله البالغه**'' کے ''**القسم الثّانی**'' میں ''**الجادّة القويمه**'' کی روشنی میں شریعتِ محمدیہ کی عملی تفصیلات اور اُن کے اسرار و رموز بیان کیے۔ خلافتِ راشدہ کی روشنی میں علم السیاست والخلافت کے قرارِ واقعی اصول اور قواعد سمجھنے کے لیے ''**ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء**'' لکھی۔ معاشی امور سے متعلق بنیادی اصول اور قواعد ''**حجّة الله البالغه**'' کے ابواب ''**من أبواب ابتغاء الرّزق**'' اور ''**من ابواب المعيشة**'' میں بیان کیے۔

شریعتِ محمدیہ سے متعلق یہ تمام علوم شریعت کے ظاہر کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔ شریعت کے باطن کو سمجھنے کے لیے علم سلوک واحسان کے قرارِ واقعی امور اور بنیادی اصول ''**حجّة الله البالغه**'' کے ایک مستقل باب ''**من ابواب الإحسان**'' میں

www.rahimia.org

بیان کیے۔ اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے ''علمِ سلوک واحسان'' کو ''علمِ حقائقِ کائنات'' سے بالکل الگ کر کے بیان کیا۔ دوسرے علم کا تعلق حقائقِ کائنات کے اسرار ورموز سے ہے، جو دراصل علمِ اَسرارِ دین کے زمرے میں شامل ہے۔

جادۂ قویمہ کی روشنی میں فہم علومِ قرآنیہ کا صحیح منہج

جادۂ قویمہ کی روشنی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فہم منطوقِ قرآنی کے لیے علومِ تفسیر اور فہم منطوقِ احادیث سے متعلق علوم الحدیث اور فہم مذاہبِ کبارِ صحابہؓ کے لیے علوم الفقہ مرتب اور مدوّن کی ہے۔ شریعتِ مطہرہ کا سب سے پہلا منبع اور اخذِ علم کا بنیادی مرکز قرآن حکیم کی نص اور اس کا منطوقِ کلام ہے۔ قرآن حکیم کے نصوص کو سمجھے بغیر فہم علم کا راستہ نہیں کھل سکتا۔ یہ راستہ سب سے زیادہ قوی اور عمدہ ترین ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"فأقواها: ما وُجد فی نصّ القرآن العظیم منطوقاً بہٖ بحیث لایخفیٰ المراد منہٗ علیٰ العارف باللّسان." (43)

(ان میں سب سے مضبوط قرآن حکیم کی ایسی نص ہے کہ کلام اسی معنی اور مطلب کے لیے چلائی گئی ہو۔ اہل زبان کے لیے اُس کی مراد اور مفہوم مخفی نہ ہو۔)

علومِ قرآنی کی تفہیم میں شاہ صاحبؒ کا تجدیدی کام

حضرت شاہ صاحبؒ نے منطوقِ قرآنی کے فہم کے لیے اصولِ تفسیر سے متعلق علوم مرتب اور مدوّن کیے۔ چناں چہ اُن کی کتاب "**الفوز الکبیر فی اصول التفسیر**" اس حوالے سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، جس کے پہلے باب میں انھوں نے منصوص ومنطوقِ قرآنی پر مبنی پانچ علومِ قرآنی کو بیان کیا۔ پھر دوسرے باب میں نظم قرآن کے معانی سمجھنے کی رُکاوٹوں پر مبنی امور کی نشان دہی کی اور اُن کا حل پیش کیا۔ مثلاً شرحِ غریب القرآن، ناسخ ومنسوخ کی بحث، اسبابِ نزول کی معرفت اور الفاظِ قرآنی اور معنی قرآنی سے متعلق بعض بنیادی امور کو سمجھنے کا مربوط نظام پیش کیا۔ پھر تیسرے باب میں اسلوبِ قرآن کی نُدرت کو بڑے منفرد انداز میں واضح کیا۔ پھر چوتھے باب میں مختلف تفسیری اسالیب اور ان کے تحلیل وتجزیے پر مشتمل بڑی جامع گفتگو کی۔ پھر اپنے جامع اسلوبِ تفسیر کی وضاحت کرتے ہوئے وہبی طور پر حاصل کیے ہوئے علم تفسیر سے متعلق پانچ علوم کی نشان دہی کی۔ اپنا جامع اسلوبِ تفسیر متعین کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے علومِ قرآنیہ کے سلسلے میں نئے اور مفید علوم کے اضافے بھی کیے۔

علم تفسیر میں شاہ صاحبؒ کے دریافت کردہ علوم

شاہ صاحبؒ ''الفوز الکبیر'' میں لکھتے ہیں:

''از علومِ وہبیہ در علم تفسیر: ......

[۱] تاویل قصص انبیاء ...... [۲] دیگر علومِ خمسہ کہ منطوقِ قرآن عظیم ہماں است ...... [۳] دیگر ترجمہ بزبانِ فارسی بوجہے کہ مشابہ عربی باشد ...... [۴] دیگر علومِ خواص قرآن است ...... [۵] یکے از علوم کہ بریں وہم ضعیف نزول فرمودہ حل معنی مقطّعات قرآن است۔'' (44)

(اللہ تعالیٰ نے وہبی طور پر علم تفسیر میں مجھے یہ علوم عطا فرمائے ہیں:

1۔ قصصِ انبیاؑ کی حقیقت و ماہیت کی تاویل وتشریح۔...

2۔ قرآن حکیم میں بیان کردہ پانچ علومِ قرآنیہ کی توضیح۔...

3۔ فارسی میں ایسا ترجمۂ قرآن، جو کہ عربی الفاظ کے عین مطابق ہے۔...

4۔ علومِ خواص القرآن: قرآنی آیات کے خواص واثرات۔...

5۔ ''مقطّعاتِ قرآنیہ'' کے معانی اور ان کے مفہوم کا حل۔)

[ا]علمِ تاویل قصص الأنبیاءؑ

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے مجھ پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدس ﷺ تک قرآن حکیم میں جتنے قصص قرآنی اور انبیا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کے صریح فہم اور ان کی تاویل وتفہیم کا دروازہ کھولا گیا۔ شاہ صاحبؒ نے اس پر ''تاویل الأحادیث'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدسؐ تک انسانی معاشرے کے ارتقا کے کون کون سے مراحل ہیں اور ہر مرحلے میں کس نبی کا کام کس نوعیت کا ہے۔ تمام انبیا کے بنیادی اساسی اصول تو ایک تھے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''إعلم أن أصل الدّین واحد، اتّفق علیه الأنبیاء و إنّما الاختلاف فی الشّرائع و المناهج.''(45)

(جاننا چاہیے کہ دین کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ اس پر تمام انبیا متفق ہیں۔ ان کے درمیان شریعت اور منہج میں اختلاف پایا جاتا ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے اس کو علمی طور پر مرتب اور مدوّن کر دیا۔

اس کتاب ''تاویل الأحادیث'' کے ساتھ ''البدور البازغه'' کا تیسرا مقالہ ملا کر پڑھا جائے، جس میں اقوام اور ملل پر گفتگو کی ہے۔ قومیں کیسے تشکیل پذیر ہوتی ہیں؟ ملتیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدسؐ اور ملتِ ابراہیمیہ حنیفیہ تک ملتوں کی اس بحث کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو قرآن حکیم میں بیان کردہ انبیا کی پوری تاریخ کا ایک مربوط خاکہ ذہن میں آ جاتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کے علمی اور عملی طریقۂ کار کی پوری نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔ پھر اسی تناظر میں حضور اقدسؐ کی ارتفاقِ رابع یعنی بین الاقوامی نظام قائم کرنے تک کے کام کی نوعیت خوب روشن ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ سیرتِ نبویؐ پر یوں تو بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے، لیکن ''تاویل الأحادیث'' کے آخر میں جو نبی اکرمؐ پر جامع اور پُر مغز گفتگو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے، وہ لائق مطالعہ ہے۔ اس مختصر سے وقت میں ہم اس پر تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے۔ اس طرح ماضی کی تاریخ کے تجزیے پر مشتمل قصص قرآنی کی ایسی تشریح وتعبیر کی کہ جس سے ہر شعبۂ زندگی میں انعام یافتہ حضرات (انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین) کے فکر وعمل کی حقانیت اور مغضوب علیہم اور ضالین کے فکر وعمل کی گمراہی بڑی خوبی سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس کی روشنی میں قرآنی علم الاحکام کی حقانیت کا پورا اثبات ہو جاتا ہے۔

[۲] قرآنی علومِ خمسہ کی بنیادی حقیقت اور ان کا صحیح فہم

منطوقِ قرآن کے فہم کے لیے دوسرا اہم ترین علم؛ علومِ خمسہ کے عنوان سے ہے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے ''الفوز الکبیر'' کے پہلے باب میں منطوقِ قرآن سے متعلق پانچ علوم؛ (۱) **علم الأحکام**، (۲) **علم المخاصمه**، (۳) **علم التّذکیر بأیّام اللّٰه**، (۴) **علم التّذکیر بالآلاء اللّٰه**، (۵) **علم التّذکیر بالموت و ما بعدهٗ** بیان کیے ہیں۔ ان علوم کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں ان پانچ علوم کے الفاظ رٹا دیے جاتے ہیں، لیکن ان پانچ علوم کی صحیح تفہیم اور منطقی توجیہ واضح نہیں کی جاتی۔ شاہ صاحبؒ نے ''**حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه**'' میں ان علوم کے نزول کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ بلکہ وہاں تو سات علوم کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہاں ''الفوز الکبیر'' میں ان کا خلاصہ پانچ کی صورت میں مرتب کر دیا ہے۔

(الف) **علم الأحکام** کی حقیقی نوعیت

ان پانچ علوم کو مربوط طور پر کچھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی بھی انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے احکامات پر مبنی قانون اور شریعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا کا ہر مذہب وملت اپنی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے قوانین بناتا ہے۔ احکامات جاری کرتا ہے۔ اس طرح انسانی معاشرے کی ترقی کا بنیادی قانون اور ضابطہ دینِ اسلام میں منطوقِ قرآن کا بیان کردہ ''علم الاحکام'' ہے۔ اس علم الاحکام میں عبادات بھی ہیں۔ ارتفاقات کی درستگی کا علم بھی ہے۔ انسانی کامیابی کے دُنیوی اور اُخروی اصول یعنی اَخلاقِ اربعہ کا علم بھی ہے۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے الفوز الکبیر میں علم الاحکام کی تفصیل بیان نہیں کی۔ دوسری کتابوں میں یعنی ''**حجّة اللّٰه البالغه**'' میں شاہ صاحبؒ نے علم الاحکام پر تفصیلی گفتگو کر دی ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جائے تو کسی بھی انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے صحیح علم اور عمل پر مبنی احکامات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ''**حجّة اللّٰه البالغه**'' میں ''**علم الأحکام**'' کے ذیل میں تین مزید علوم کا تذکرہ کیا ہے:

1۔ **علم التّوحید و الصِّفات**: اس علم میں عام انسانی عقل کے مطابق اللہ کی ذات وصفات سمجھائی گئی ہیں۔
2۔ **علم العِبادات**: اس علم میں قربِ بارگاہِ الٰہی کے حصول کے طریقہ ہائے عبادت بتلائے گئے ہیں۔
3۔ **علم الارتفاقات**: اس علم میں انسانی اجتماعیت کے لیے سہولتوں پر مبنی چار مراحل کی تفہیم کی جاتی ہے۔(46)

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ جہاں علم صحیح ہو اور عمل صحیح ہو، یعنی اس کام کو سرانجام دینے کا ٹھیک ٹھیک (perfect) عملی ڈھانچہ آپ بتلائیں اور اس کا صحیح علمی فکر اور نقطۂ نظر دوٹوک انداز میں بتلائیں تو وہ علم صحیح ہوتا ہے اور عمل صحیح ہوتا ہے۔ علم صحیح سے جہالت دور ہوتی ہے اور عمل صحیح سے ظلم ختم ہو کر عدل وانصاف قائم ہوتا ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم نے اپنے نزول کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (47)

(ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو، پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے، اور اٹھا لیا اس کو انسان نے، یہ ہے بڑا بے ترس نادان۔)

www.rahimia.org

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ انسان میں جہالت اور ظلمت موجود تھی۔ اس کی ظلمت اور ناانصافی عدل وانصاف کے معیار کے مطابق عمل کرنے سے دور ہوتی ہے اور اس کی جہالت علم سے دور ہوتی ہے۔ تو ظلوم وجہول کی ضد علم وعدل ہے۔ تو علم وعدل کی بنیاد پر جو فکر وعمل وجود میں آتا ہے اور اس کی اساس پر کوئی حکم جاری ہوتا ہے تو سوسائٹی ترقی کرتی ہے۔ اس طرح **علم الأحکام** کی روشنی میں انھوں نے یہ واضح کیا کہ صحیح علم وعمل پر مشتمل احکامِ شریعت جو منصوص ومنطوق قرآن سے ثابت ہیں، وہی حق ہیں۔ انھیں کے ذریعے سے انسانی سماج ترقی کرسکتا ہے۔

(ب) علم المخاصمه (علم مباحثہ ومکالمہ) کا صحیح فہم

علم المخاصمہ کی صحیح حیثیت اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ صحیح علم اور صحیح عمل پر مبنی قرآنی علم الاحکام سے متصادم فکر وعمل کے ممکنہ چار پہلو ہوسکتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ علم تو ہو، لیکن اس پر مادی مفادات کی وجہ سے عمل نہ کیا جائے۔ جیسے یہودیت کے پاس تورات تھی، لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّایَ فَاتَّقُوْنِ (48) ایسے لوگ ''مغضوب علیہم'' ہیں۔

(۲) عیسائیت کے پاس علم ندارد، لیکن رہبانیت اختیار کرکے علم صحیح کے بغیر عمل کرتے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی ''ضالّین''، یعنی گم کردۂ راہ کی صورت میں ناکام ہیں۔ عیسائیت کا تذکرہ۔

(۳) اسی طریقے سے وہ لوگ جو صحیح علم اور صحیح عمل دونوں کے منکر ہیں وہ مشرک ہیں۔

(۴) اور جو علم صحیح اور عمل صحیح یعنی اسلام کے احکامات کو بہ ظاہر قبول کرتے ہیں، لیکن عمل نہیں کرتے، منافقین ہیں۔

قرآنی علم الاحکام سے متصادم ممکنہ شکلیں چار ہیں۔ قرآن نے ان چاروں گروہوں کے ساتھ مباحثہ کیا ہے۔ **علم المخاصمه** کی روشنی میں ناقص علم اور ناقص عمل پر مشتمل چار مختلف فرقوں؛ یہودیت، عیسائیت، مشرکین اور منافقین کے فکر وعمل کی فکری اور عملی خرابیاں واضح کیں۔ اس طرح علم الاحکام سے متضاد جتنے بھی چار مکتبہ ہائے فکر یا سکول آف تھاٹ تھے، قرآن نے ان سے مکالمہ کیا اور ان کے شکوک وشبہات دور کرکے قرآنی علم الاحکام کو مستحکم اور مضبوط بنایا۔

(ج) علم التّذکیرات

پھر شاہ صاحبؒ نے **علم التّذکیرات** کی روشنی میں ماضی کی تاریخ، حال کے انعاماتِ الٰہیہ اور موت کے بعد کے حالات سے سبق سیکھنے اور موعظت حاصل کرنے کی حقیقت واضح کی۔ **علم الأحکام** درست طور پر سوسائٹی میں تبھی واضح ہوتا ہے کہ جب لوگوں کو یہ بتلایا جائے کہ جو حکم دیا گیا ہے وہ صحیح علم اور عمل پر مبنی ہے۔ یہ ماضی میں بھی درست تھا، حال پر غور وفکر سے بھی اسے سمجھا جاسکتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی اس کے درست نتائج آئیں گے۔ اس کے لیے تین تذکیرات ہیں:

(ج-۱) علم تذکیر بأیّام اللّٰہ

علم تذکیر بایام اللہ یہ ہے کہ دینِ حق پر جب حضرت ابراہیمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داوٗدؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے عمل کیا تو اس انعام یافتہ جماعت کے حق میں بہتر نتیجہ نکلا۔ اور ان احکامات کو نہ ماننے والے نمرود، شداد، فرعون، قارون اور ہامان

نےعمل نہیں کیا تو کیسا بُرا نتیجہ نکلا۔ اس تذ کیر سے ماضی میں الٰہی علم الاحکام کی حقانیت واضح ہوتی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تذ کیر کوئی وعظ و نصیحت ہے بس۔ اس کا علم الاحکام کے فہم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ یہ تذ کیرات دراصل علم الاحکام کی حقانیت کو واضح کرتی ہیں۔ علم تاویل الاحادیث پڑھا ہوا ہوتو یہ سمجھنا مزید آسان ہوجاتا ہے۔

(ج-۲) علم تذکیر بآلاء اللّٰہ

اسی طریقے سے تذکیر بآلاء اللہ کی تفہیم ہے۔ انسان کے گرد و پیش میں جو ایک مربوط نظام سورج، چاند، ستاروں اور زمین پر معدنیات، نباتات اور حیوانات کی صورت میں انعاماتِ الٰہیہ موجود ہیں، ان کی روشنی میں قرآن حکیم نے اپنے احکامات کی حقانیت ثابت کی ہے کہ جب یہ کائنات ایک سسٹم کے تحت چل رہی ہے تو انسانی سوسائٹی کو ایک مضبوط سسٹم اور حکم کے تحت کیوں نہیں چلایا جانا چاہیے؟

(ج-۳) علم التّذکیر بالموت و ما بعدہٗ

پھر قرآنی علم الاحکام پر عمل درآمد یا ان کے انکار کے اثرات ونتائج موت کے بعد ظاہر ہوں گے۔ گزشتہ واقعات کے تناظر میں اور موت کے بعد کے جو اعمال کے نتائج ہیں، اس کی گفتگو کے تناظر میں قرآن نے واضح کیا کہ جنھوں نے صحیح عمل کیا، اس کی یہ حالت انعام ہے اور جنھوں نے غلط عمل کیا، ان کی یہ حالتِ سزا ہے۔

یہ علومِ خمسہ کی ایسی جامع تشریح اور منطقی توجیہ ہے کہ جس سے قرآنی علم الاحکام مربوط اور مستحکم طور پر ہر انسان کو سمجھانا آسان ہوگیا۔ علومِ خمسہ پر علمی اور تحقیقی بحث حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی دیگر کتابوں **حجۃ اللّٰہ البالغہ، سطعات اور البدور البازغہ** وغیرہ میں انتہائی محققانہ انداز میں بیان کی ہیں۔

[۳] ترجمۂ قرآن حکیم کا جامع علمی اسلوب

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ مجھے ایک تیسرا علم ''**علم ترجمۃ القرآن**'' دیا گیا۔ قرآن حکیم کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا علم۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلے اس علم کے بنیادی اصول وضوابط بیان کرنے کے لیے ''**المقدمہ فی قوانین الترجمہ**'' کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ لکھا۔ پھر اس کی روشنی میں ''**فتح الرّحمٰن بترجمۃ القُرآن**'' کے نام سے ایک معیاری ترجمہ قرآن پاک کیا۔ ترجمہ تحریر کرنے کے بعد اس کے مزید اصول بیان کرنے کے لیے ایک مقدمہ ''**مقدمہ فتح الرّحمٰن**'' لکھا ہے۔ یہ تین کتابیں ہمارے پیش نظر رہیں تو شاہ صاحبؒ کا **علم ترجمۃ القرآن** ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے پہلے جن لوگوں نے بھی لفظی یا معنوی ترجمے کیے ہیں، ان ترجموں میں چار خرابیاں ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ قرآن حکیم کا ترجمہ اتنے ہی الفاظ اور اُسی جامعیت کے ساتھ ہونا چاہیے، جس طرح کہ اصل قرآنی الفاظ اور اس کے عربی نظم کے ہیں۔ ترجمہ نہ اس سے زائد ہو اور نہ کم۔ اور آیت کا مفہوم بھی پورا پورا ادا ہو۔ یہ تیسرا علم شاہ صاحب کہتے ہیں منطوقِ قرآن کے فہم کے لیے ضروری ہے۔ عربوں کے لیے تو عربی ٹھیک ہے، لیکن غیر عربوں کو اگر منطوقِ قرآن سمجھانا ہے تو جامع اسلوب میں اس کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ تبھی قرآن حکیم کا منطوق صحیح طور پر سمجھ میں آئے گا۔ ورنہ تو ادھورا اور

www.rahimia.org

ناقص مفہوم سمجھیں گے۔ اس طرح شاہ صاحبؒ نے ترجمہ نگاری کے ناقص اور ادھورے اسالیب کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے ترجمے کے صحیح اصول اور ضابطے اور قوانین واضح کیے۔

[۴] علومِ خواص القرآن

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ مجھے چوتھا علم ''علم خواص القرآن'' دیا گیا ہے۔ اس علم میں انسانی روح کو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق قائم کرنے کے لیے اسماء الحسنیٰ اور قرآنی آیات کے خواص اور تاثیرات بیان کی گئی ہیں۔ قرآن حکیم کے فہم و شعور اور اس کی تلاوت کے ساتھ انسانی روح اور قلب کو جوڑنے سے جو فیضانِ قرآنی کا دروازہ کھلتا ہے، اس کی حقیقت شاہ صاحبؒ نے بیان کی ہے۔ قرآن حکیم کے خواص سے متعلق علوم کی وضاحت کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے ''الخیر الکثیر'' تحریر فرمائی۔

تصوف کے حصول کا صحیح راستہ قرآن کے فیض کے ذریعے سے سلوک الی اللہ کی منزلوں کو طے کرنا ہے۔ اگر قرآن کے فیض سے ہٹ کر محض شخصیات کی قیودات میں یا تقیدات میں رہا جائے تو یہ شخصیات کے رجعت پسندانہ تصور کو ہی روح پر مسلط کر دیتا ہے۔ اس سے آزادئ روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس پر شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''**التفهيمات الإلٰهيه**'' کی چند **تفهيمات** میں بحث کی ہے۔ یہ وہ علم نہیں جو علم الاعداد کی بنیاد پر تعویذات اور گنڈوں کے حوالے سے کاروبار بن چکا ہے۔ یہ وہ علم خواص القرآن ہے، جو روح اور سلوک اور اخلاص اور تزکیے کے لیے بنیاد بنتا ہے۔

یہ علم اس تناظر میں بڑا اہمیت رکھتا ہے کہ رسم پرست جاہل صوفیا نے انسانی تزکیے اور تربیت کے نام پر ایسے خودساختہ وظائف اور رسومات اختیار کر لی تھیں، جو قرآن حکیم کی تعلیمات سے متصادم تھیں۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے علومِ خواص القرآن کے ذیل میں تربیت اور تزکیے کا ایک مکمل علمی نظام واضح کیا۔ ان علوم کی اَبحاث حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی دیگر کتابوں؛ ''**سطعات**''، ''**لمحات**'' اور ''**الطاف القدس**'' میں بھی بیان کی ہیں۔

[۵] حروف مقطّعاتِ قرآنیہ کا علمی حل

پانچواں علم جس کے بارے میں شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ مجھ پر اللہ پاک نے اس کا دروازہ بھی کھولا، وہ قرآنی سورتوں کے آغاز میں آنے والے حروفِ مقطعات کے معانی اور مفاہیم کا علم ہے۔ یاد رہے کہ یہ علم قطعی نہیں ہے، بلکہ ظنی ہے۔ اس علم کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم جس عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس کا ہر حرفِ تہجی اپنا ایک معنی اور مفہوم رکھتا ہے۔ عربی زبان دنیا کی واحد زبان ہے کہ جس کا ہر حرف اپنی ایک معنویت رکھتا ہے۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ''براہینِ قاسمیہ'' میں لکھا ہے کہ:

> ''دنیا کی دیگر زبانوں کے حروفِ تہجی اس وقت تک کوئی معنی نہیں دیتے، جب تک وہ باقی حروف کے ساتھ مل کر اسم یا فعل نہ بنیں۔ لیکن عربی واحد زبان ہے کہ جس کی **فقہ اللُّغة** اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس کے ہر مادے یعنی فَعَلَ کا فا، عین اور لام کلمے کا ہر ہر حرف اپنی حرفی حیثیت میں بھی ایک معنویت رکھتا ہے۔ اور جب وہ کسی فعل یا اسم کی حیثیت میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے فا، عین اور لام کلمے میں موجودگی کے باعث اس اسم اور فعل کی معنویت میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔''(49)

قرآنی سورتوں کے شروع میں آنے والے حروفِ مقطعات کی تحقیقی اور عملی تشریح کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''الفوز الکبیر'' کے پانچویں باب کی ایک مستقل فصل میں بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ جس میں شاہ صاحبؒ نے عربی زبان کے حروفِ تہجی کی ترتیب و تدوین اور اُن کے معنوی اثرات ونتائج پر بحث کرتے ہوئے **فقه اللُّغه** کی روشنی میں حروفِ مقطعات کے مفاہیم متعین کیے ہیں۔ اس سلسلے سے متعلق ہر حرفِ تہجی کی معنویت واضح کرنے کے لیے ''**الخیر الکثیر**'' میں بھی بہت عمدہ بحث کی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے اس علم کی صحیح اور محققانہ عقلی توجیہ اور ترتیب حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ''**براهینِ قاسمیه**'' میں بھی کی ہے۔

یہ پانچ علومِ قرآنیہ ایسے ہیں کہ قرآن حکیم کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے جن بنیادی اساسی امور کی ضرورت ہے، وہ ان پانچ علوم میں بیان ہوجاتے ہیں۔ ان علوم کی پوری حقیقت کا فہم رکھتے ہوئے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا جائے تو انسانی معاشرے کی تشکیل میں شریعت، طریقت اور سیاست پر مبنی تمام دینی پہلوؤں کا احاطہ ہوجاتا ہے۔ جن علمائے ربانیین نے ان علومِ قرآنیہ کا فہم وشعور حاصل کیا، وہ قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لیے کام کرنے والے مجددین علمائے ربانیین کا حصہ بنے۔ اور انھوں نے ان کے فیوض و برکات سے بہت استفادہ کیا۔

جادۂ قویمہ کی روشنی میں علوم الحدیث کی تفہیم

جادۂ قویمہ کا دوسرا شعبہ تھا احادیثِ مستفیضہ۔ شاہ صاحبؒ نے اس کے لیے بھی بڑی اہم بنیادی بات کہی۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس زمانے میں ہر طبقۂ حدیث پر بحث کرکے حدیثِ مستفیض یا مشہور احادیث اور اخبارِ اُحاد کے بارے میں تحقیق وتجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ اس زمانے میں تو جو کتبِ حدیث مدوّن شدہ ہیں، اس کے طبقات متعین کیے جائیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے ''**حجّة اللّٰه البالغه**'' میں ''**باب طبقاتِ کتب الحدیث**'' مرتب کرکے چار طبقاتِ کتبِ حدیث بیان کیے۔ شاہ صاحبؒ نے بتلایا کہ احادیثِ مستفیضہ وہ ہیں جو **مؤطا، بخاری اور مسلم** میں ہوں اور جن پر یہ تینوں متفق ہیں اور جن پر صحابہ کرامؓ نے یا امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ قرآن حکیم کے بعد ایسی احادیثِ مستفیضہ کا درجہ ہے۔ اور پھر ان کے لیے بھی شاہ صاحب نے چار پانچ شرائط بیان کی ہیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے کتبِ حدیث کے چار طبقات متعین کیے ہیں۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> **''إعلم! أنّهٗ لا سبیل لنا إلٰی معرفة الشّرائع و الأحکام، إلّا خبر النّبی ﷺ بخلاف المصالح، فإنّها قد تُدرک بالتّجربة، و النّظر الصّادق، و الحدس، و نحو ذٰلک. و لا سبیل لنا إلیٰ معرفة أخبارہٖ ﷺ إلّا تلقّی الرّوایات المنتهیة إلیه ... و تلقّی تلک الروایات لا سبیل إلیه فی یومنا هٰذا إلّا تتبّع الکتب المدوّنة فی علم الحدیث. فإنّهٗ لا یوجد الیوم روایة یُعتمد علیها غیر مدوّنة. و کتب الحدیث علیٰ طبقات مختلفة و منازل متباینة، فوجب الاعتناء بمعرفة طبقات کتب الحدیث، فنقول هی باعتبار الصّحّة و الشّهرة علیٰ أربع طبقات ...:**
>
> **فالطّبقة الأولیٰ: منحصرة بالاستقراء فی ثلاثة کتب:**

www.rahimia.org

(١) المؤطّا، (٢) و صحیح البخاری، (٣) و صحیح المسلم.
و الطّبقة الثّانیة: کتب لم تبلغ مبلغ المؤطّا و الصّحیحین و لکنّها تتلوها. ...
ک (١) سنن ابی داؤد، (٢) و جامع التّرمذی، (٣) و مجتبیٰ النّسائی ...
و کاد مسند أحمد یکون من جملة هٰذه الطّبقة.
و الطّبقة الثّالثة: مسانید و جوامع و مصنّفات ...
کمسند ابی یعلیٰ، و مصنّف عبدالرّزّاق، و کتب البیهقی، و الطّحاوی.

و الطّبقة الرّابعة: کتب قصد مصنّفها بعد قرون متطاولة، جمع ما لم یوجد فی الطّبقتین الأولیین، کانت فی المجامیع و المسانید المختفیة ... و مظنّة هٰذه الأحادیث کتاب الضّعفاء لابن حبّان، و کامل ابن عدیّ ... و أصلح هٰذه الطّبقة ما کان ضعیفاً محتملاً و أسوؤها ما کان موضوعاً أو مقلوباً شدیدة النّکارة و هٰذهٖ الطّبقة مادّة کتاب الموضوعات لابن الجوزیّ." (50)

(جاننا چاہیے کہ ہمارے لیے نبی اکرم ﷺ کی احادیث معلوم کیے بغیر شریعتوں اور احکامات کو جاننے کا کوئی اَور راستہ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف انسانی سوسائٹی کی مصلحتوں کو تجربات اور صحیح فکر و نظر اور اندازے سے بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔

حضور ﷺ کی احادیث کی معرفت اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ حضورؐ سے مروی روایات کی صحیح سند معلوم نہ ہوجائے۔ ہمارے اس زمانے میں ان روایات کو معلوم کرنے کا اس کے علاوہ اَور کوئی راستہ نہیں کہ علم حدیث میں مدوّن کی گئی کتابوں سے رہنمائی لی جائے۔ اس لیے کہ آج اس زمانے میں کوئی ایسی معتمد روایت موجود نہیں ہے، جو علم حدیث کی مدوّن کتابوں میں موجود نہ ہو۔ جب کہ علم حدیث کی کتابیں چند مختلف طبقات پر مشتمل ہیں اور مختلف مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ کتبِ حدیث کے طبقات معلوم کرنے پر توجہ دی جائے۔

چناں چہ ہم کہتے ہیں کہ صحت اور شہرت کے اعتبار سے کتبِ حدیث کے چار طبقے ہیں:

(١) پہلا طبقہ تین کتابوں میں منحصر ہے: مؤطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔

(٢) دوسرا طبقہ ایسی کتابوں پر مشتمل ہے، جو مؤطا اور صحیحین کے مرتبے کو نہیں پہنچتیں۔ ان کا درجہ ان تین کتابوں کے بعد ہے۔ یہ کتابیں سنن ابوداؤد، جامع ترمذی اور مجتبیٰ نسائی ہیں اور مسند احمد بھی تقریباً اسی طبقے میں شامل ہو۔

(٣) تیسرا طبقہ ایسی مسانید، جوامع اور مصنفات پر مشتمل ہے، جو امام بخاری اور امام مسلم سے پہلے اور بعد لکھی گئیں۔ اوران میں ہر طرح کی حدیث جمع کی گئی، جیسے مسند ابویعلیٰ، مصنّف عبدالرّزّاق، بیہقی، طحاوی اور طبرانی کی کتابیں ہیں۔

(٤) چوتھا طبقہ ایسی کتابوں کا ہے کہ جن کے مصنّفین نے ایک لمبے زمانے کے بعد ایسی روایات کو جمع کیا، جو پہلے دو

www.rahimia.org

طبقوں کی کتابوں میں موجود نہیں تھیں۔ ایسی کتابوں میں ابن حبان کی کتاب الضعفاء اور ابن عدی کی الکامل وغیرہ ہیں۔ اس طبقے کی سب سے بہترین حدیث وہ ہے جو ضعیف ہو اور اس میں صحیح ہونے کا احتمال ہو۔ اس طبقے کی بدترین حدیث وہ ہے، جو خود ساختہ ہو۔ یہی وہ طبقہ ہے، جس کو بنیاد بنا کر علامہ ابن جوزی نے ''کتاب الموضوعات'' لکھی ہے۔)

ان کے تعین کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''حجّة اللّٰه البالغه'' میں کتبِ حدیث کے طبقات کا تعین کیا ہے۔ اس سلسلے میں طبقہ اولیٰ کی تین کتابوں؛ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مؤطا امام مالک میں موجود احادیثِ مستفیضہ سے چند شرائط کے ساتھ اخذ و استنباط کو ضروری قرار دیا۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و يتلوهٗ: ما نطق بهٖ الأحاديث المستفيضة الصّحيحة المروية فى صحيحى الشّيخين: ابى عبدالله البخارىؒ و مسلم النّيسابورىؒ و مؤطّا الإمام مالكؒ من غير تعارض الأخبار، و الاختلاف الفاحش فى ألفاظ الرّوايات. أعنى: بذٰلک ما تجتمع فيه أربعة شُروطٍ:

(١) يكون صريحاً فى معناهُ لايخفىٰ المراد منهُ علىٰ العارف باللِّسان.

(٢) ويكون مستفيضاً، قد رواهُ من الصّحابة ثلاثة فأكثر، ثمّ لم يزل يتزايد الرّواة فى كلّ طبقةٍ حتّىٰ جاء ت طبقة حفّاظ الحديث و جهابذة الفقهاء فارتضوهُ و قالوا بهٖ.

(٣) ويكون مرويّاً فى هٰذهِ الكتب الثّلاثة:

(الف) فإنّ لها شاناً فى الإسلام ليس لغيرها.

(ب) و أنّ لها قبولاً عند العلماء بالحديث و الفقه، ليس لغيرهما.

(ج) و أنّ لها صحةً لم يشهدوا بمثلها فى غيرها.

(د) و أنّ لها اشتهاراً فى علماء الحديث و الفقه، مشارقتها و مغاربتها الحجازيّين منهم، و الشّاميّين، و العراقيّين، ليس مثلهٗ لغيرها.

(ه) و أنّ للقوم اشتغالاً بشرح غريبها و ضبط مشكلها و تخريج فِقهِها و ذكر رُوَاتها، ليس لهم مثل ذلک الاشتغال بغير هٰذهِ الكتب، و هٰذا لامر لا يكاد يخفىٰ إلَّا علىٰ أجنبى عن مدارک القوم.

(٤) و لا يكون هناک تعارض الأخبار عن النّبىّ ﷺ، لا سيّما فى مثل هٰذهِ الكتب.'' (51)

(اس کے بعد وہ علم ہے جو صحیح اور مستفیض احادیث سے معلوم ہوا ہو۔ ایسی احادیث جو امام ابوعبداللہ بخاریؒ اور امام مسلم نیشاپوریؒ کی صحیحین اور مؤطا امام مالک میں ہوں اور اُن احادیث میں تعارض بھی نہ ہو اور روایات کے الفاظ میں کوئی بڑا اختلاف بھی نہ پایا جاتا ہو۔ اس سے میری مراد درجِ ذیل چار شرائط کا پایا جانا ہے:

1۔ وہ حدیث اپنے معنی اور مفہوم میں ایسی واضح اور صریح ہو کہ عربی زبان جاننے والوں پر اس کا معنی اور مراد مخفی نہ ہو۔

2۔ وہ حدیث مستفیض ہو، یعنی اسے کم از کم تین صحابہؓ یا زیادہ نے روایت کیا ہو۔ پھر بعد کے ہر طبقے میں اُس کے

www.rahimia.org

راوی مسلسل بڑھتے رہیں۔ یہاں تک کہ حفاظِ حدیث اور فقہا مجتہدین کے طبقے کے لوگ اس حدیث کو قبول کرلیں اور اس کے مطابق اپنی رائے اختیار کرلیں۔

3۔ وہ حدیث (طبقہ اولیٰ کی) ان تینوں کتابوں (مؤطا، بخاری اور مسلم) میں مروی ہو۔ اس لیے کہ:

(الف) ان کتابوں کی اسلام میں ایسی شان ہے جو کسی اَور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

(ب) حدیث اور فقہ کے علما نے ان تینوں کتابوں کو اس طرح قبول کیا ہے کہ کسی اَور کتاب کو یہ رُتبہ حاصل نہیں ہے۔

(ج) علما نے ان کتابوں کی صحت کی گواہی کچھ اس طرح سے دی ہے کہ کسی اَور کتاب کے لیے ایسی گواہی موجود نہیں ہے۔

(د) ان تینوں کتابوں کو حدیث اور فقہ کے علما میں خوب شہرت حاصل ہے، وہ علما مشرق میں رہنے والے ہوں یا مغرب کے۔ حجاز میں رہنے والے ہوں یا شام اور عراق میں۔ ان کتابوں کے علاوہ کسی دوسری کتاب کو اہل علم میں اس طرح شہرت حاصل نہیں ہوئی۔

(ہ) علما نے ان کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں ایسی مشغولیت اختیار کی ہے کہ انھوں نے ان کے غریب الفاظ کی شرح لکھی۔ اس کے مشکل الفاظ کو منضبط کیا۔ ان کی فقہ کی تخریج کی۔ ان کے راویوں پر پوری بحث کی۔ ان تین کتابوں کے علاوہ کسی اَور کتاب میں اس طرح علما نے مشغولیت اختیار نہیں کی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کسی پر مخفی نہیں، سوائے اُس کے جو علما کے علوم سے بالکل اجنبی ہو۔

4۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ نبی اکرمؐ سے مروی احادیث میں کوئی تعارض نہ ہو۔ خاص طور پر ان کتابوں میں موجود کسی حدیث کی کوئی اَور حدیث معارض نہ ہو۔)

اکابر صحابہؓ اور تابعینؒ کے مذاہب اور تعامل کی تفہیم

جادۂ قویمہ کی تیسری بنیادی چیز کبارِ صحابہؓ کے مذاہب کا تعین ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک احادیثِ مستفیضہ کے بعد اکابر صحابہؓ اور تابعینؒ کے اختیار کردہ مذاہب کی اہمیت ہے۔ اس حوالے سے تعاملِ اہلِ مدینہ اور اور تعاملِ اہلِ کوفہ کی تفہیم بھی ضروری ہے۔ اس حوالے سے حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''و یتلوہٗ ما حکاہٗ مالکؒ فی المؤطّا: ''أنّہٗ مذھب کبار الصّحابۃؓ و التّابعینؒ و الّذی جریٰ علیہ عمل أھل المدینۃ من لّدن زمان النبوۃ إلیٰ زمانہٖ (ﷺ)''. ثمّ لم یتعقّبہٗ الشّافعیؒ و أحمدؒ و البخاریؒ و أمثالھم من الجامعین بین الفقہ و الحدیث فیما قد رَوَوْہُ بل ارتضوہٗ و قالوا بہٖ و شدّوہٗ:

(۱) بصریح أخبارٍ جاء ت من النّبیّ ﷺ صحیحۃً أو حسنۃً، و لو کانت من باب أخبار الأحاد.

(۲) أو بدلالتھا و إشارتھا.

(۳) أو بآثار جمّ غفیرٍ من الصّحابۃؓ و التّابعینؒ.

(۴) أو بقیاسٍ واضحٍ و استنباط قویٍّ.
و فی حکم ما حکاہُ مالکؒ کذلک ممّا کان مثلہُ ممّا یرویہِ سفیان الثّوریؒ مثلاً. و لکن فی حکایۃ مالک أکثر و أوثق، و فی روایۃ غیرہٖ لاتجد ذٰلک إلّا أقلّ قلیل. (52)

(اس کے بعد کبار صحابہؓ کے اُن اقوال کا درجہ ہے کہ جنھیں امام مالکؒ نے مؤطا میں بیان کرتے ہوئے یہ وضاحت کی ہے کہ: ''یہ کبار صحابہؓ اور تابعینؒ کا مذہب ہے اور جس پر زمانۂ نبوت سے لے کر اب تک اہلِ مدینہ کا عمل جاری ہے۔'' پھر امام مالکؒ کے نقل کیے ہوئے اس قول کو امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام بخاریؒ جیسے فقہ اور حدیث کے جامع افراد نے روایت کیا اور اس پر کوئی گرفت نہ کی ہو، بلکہ انھوں نے وہ اس سے راضی ہوں اور اسے انھوں نے اپنا مذہب قرار دیا ہو اور اس کی مضبوطی کے لیے دیگر صحیح یا حسن احادیث کے ذریعے یا خبرِ واحد کی دلالت النص یا اشارت النص کے ذریعے دلائل دیے ہوں۔ اور اس کی تائید میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے جم غفیر کے آثار اور واضح قیاس اور مضبوط استنباطات پیش کیے ہوں۔

تعاملِ اہلِ مدینہ سے متعلق امام مالکؒ کے نقل کردہ اقوال ہی کی طرح تعاملِ اہلِ کوفہ کی اُن روایات اور اقوال کی حیثیت ہے، جو امام سفیان ثوریؒ وغیرہ نے نقل کیے ہیں، لیکن امام مالکؒ کے نقل کردہ اقوال زیادہ تعداد میں ہیں اور زیادہ قابلِ بھروسہ ہیں اور دوسرے افراد کی روایات کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔)

اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے مؤطا کو مرکز اور محور بنایا ہے اور ''المُسوّٰی من أحادیث المؤطّا'' مؤطا کی ایک نئی ترتیب قائم کی ہے۔ اس کتاب میں مؤطا سے احادیث پر کبار صحابہؓ کے مذاہب لے کر فقہ حنفی اور فقہ شافعی کے اختیار کردہ فقہی اقوال کی نئی ترتیب قائم کی۔ اکابر صحابہؓ کا تعین کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے ''حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ'' میں لکھا ہے کہ:

''و أکابر ھٰذا الوجہ من الصّحابۃ: عمرؓ، و علیؓ، و ابنِ مسعودؓ، و ابنِ عباس رضی اللّٰہ عنھم، لٰکن کان من سیرۃ عمر رضی اللّٰہ عنہُ انہُ کان یشاور صحابۃؓ و یناظرھم، حتّٰی تنکشف الغمّۃ و یأتیہ الثّلج، فصار غالب قضایاہ و فتاواہ متّبعۃ فی مشارق الأرض و مغاربھا. و کان علی رضی اللّٰہ عنہُ لا یشاور غالباً، و کان أغلب قضایاہ بالکوفۃ، و لم یحملھا عنہُ إلّا ناسٌ. و کان ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہُ بالکوفۃ، فلم یحمل عنہُ غالباً إلّا أھل تلک الناحیۃ. و کان ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما اجتھد بعد عصر الأوّلین.'' (53)

(حضورؐ کے اقوال و افعال کو نقل کرنے والے کبار صحابہؓ میں چار حضرات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں: حضرت عمر فاروق، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، لیکن حضرت عمرؓ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ وہ دیگر صحابہؓ سے مشاورت اور مباحثہ کرتے تھے، یہاں تک کہ مسئلہ نکھر کر سامنے آجائے اور دل ٹھنڈا ہوجائے۔ اسی لیے اُن کے جاری کردہ اکثر فیصلوں اور فتوؤں کی کرۂ ارض کے تمام مشرقی اور مغربی علاقوں میں اتباع کی گئی ہے۔ اور حضرت علیؓ عام طور پر مشورہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے زیادہ تر فیصلے کوفہ میں ہوئے اور اُن سے روایت

www.rahimia.org

کرنے والے صرف چند افراد ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ میں تھے۔ اُن سے روایت کرنے والے زیادہ تر لوگ اُسی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے پہلے لوگوں کے بعد اجتہادات کیے۔)

شاہ صاحبؒ نے ان چاروں کبار صحابہؓ اور مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ میں موجود فقہائے سبعہ کے اقوال کی روشنی میں حنفی اور شافعی دونوں فقہی مذاہب کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے ''المسوی'' میں ان کے تمام اقوال جمع کردیے ہیں۔

پھر ان حضرات کے مذاہب پر شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''عِقد الجید فی الاجتهاد و التّقلید'' میں اور اسی طریقے سے ''الإنصاف فی بیان سبب الاختلاف'' میں اور ''حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' میں گفتگو کی ہے، ان کتابوں میں اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہؓ کے تعامل پر مبنی دو ہی مراکز ہیں: ایک تعاملِ اہلِ مدینہ ہے، جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عمر فاروقؓ وغیرہ وغیرہ سے ہوتا ہوا حضرت امام مالکؒ تک آتا ہے، جس کو امام مالکؒ نے ''مؤطّا'' میں مدوّن کردیا۔ اور دوسرا تعامل اہل کوفہ ہے۔ 17ہجری میں کوفہ شہر حضرت عمر فاروقؓ نے بسایا اور اسے بین الاقوامی مرکز بنادیا۔ دنیا بھر سے لوگ یہاں آتے تھے۔ یہ ایک فوجی چھاؤنی بھی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کوفہ والوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے قریب ترین رفیق، فقیہ اور مجتہد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو سب سے پہلے یہاں بھیجا۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے انتقال کے بعد امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰؓ کا کوفہ اور بصرہ میں قیام رہا۔ کوفہ اور بصرہ میں جو صحابہؓ گئے، اُن کے تعامل کو ''تعاملِ اہلِ کوفہ'' کہا جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ایک تعامل کی نمائندگی امام مالک، اور امام مالک کے اس تعامل پر جو تنقید مکہ سے امام شافعیؒ نے کی، یہ بھی تعامل اہل مدینہ کا ہی مکتبِ فکر ہے۔ اور پھر اس کے مقابلے پر جو اہل کوفہ تھے، جن میں امام ابراہیم نخعیؒ اور امام سفیانِ ثوریؒ ہیں، ان سب حضراتؒ کے فقہی مسلک کو امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ نے مرتب کیا۔ اس کے بعد امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے ''کتاب الحجه علیٰ أهل المدینه'' لکھی۔ جس میں اہل مدینہ کے تعامل پر، تعامل کوفہ کے تناظر میں گفتگو کی۔ اس تناظر میں شاہ صاحبؒ نے ان دونوں تعامل کو سامنے رکھا ہے۔ اور اس کے لیے مسویٰ میں فقہ شافعی، فقہ مالکی اور فقہ حنفی، ان کی مستند کتابوں سے جو اجماعِ صحابہؓ سے متعلق اقوال ہیں، وہ جمع کرکے، تجزیہ کرکے ایک رائے قائم کی۔

یہ کبارِ صحابہؓ کا متفق علیہ رائے کا عمل ہے۔ اور اس میں اگر کہیں اختلاف پایا گیا ہے تو اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے ایک اَور علم دریافت کیا ہے، علم تطبیق الآراء۔ جس کے ذریعے سے شاہ صاحبؒ نے ان تینوں مکاتب ہائے فکر کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کا کام کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں فقہ شافعی اور فقہ حنفی اور ایک مخصوص خطے میں فقہ مالکی ہے، انھیں کا تجزیہ کرنے سے جامع دین سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح ''المُسوّی''، مکمل ہوئی۔

حدیثِ صحیح اور حسن کی تفہیم کے معیارات

شاہ صاحبؒ نے جادۂ قویمہ کا چوتھا نقطہ متعین کرتے ہوئے حدیثِ صحیح یا حسن احادیث کی دریافت کے لیے طبقہ دوم کی تین کتابوں؛ ترمذی، ابوداؤد اور النّسائی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و یتلوهٗ: ما صحّ فیهِ حدیثٌ صحیحٌ أو حسن فی الکتب المشهورة و قام بمثلهٖ الحجّة، و أخذ بهٖ جماعة من الفقهاء. أو کان استنباطاً صحیحاً قویاً شهد لهٗ الجماعة بالصّحیة. و اللّٰه أعلم.

www.rahimia.org

فھـذا کـلّہٗ ظاھر شریعۃ النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم و الجادّۃ القویمۃ من سننہٖ البیّن رُشدُھا و الباھرُ قدرُھا.'' (54)

(کبارصحابہؓ کے اجماع کے بعد وہ روایات ہیں، جومشہور کتابوں میں صحیح حدیث یا حسن حدیث کی صورت میں روایت کی گئی ہیں اور ایسی روایات سے حجت قائم کی جاسکتی ہو۔ اور اُن روایات کو فقہا کی ایک جماعت نے اپنا مسلک بنایا ہو، یا ایسی احادیث ہوں، جن سے صحیح اور قوی اخذ و استنباط کیا ہو اور اس کے صحیح ہونے پر ایک جماعت نے گواہی دی ہو۔ یہ تمام نبی اکرمؐ کی شریعت کا ظاہر ہے اور حضورؐ کی سنت کا قائم کردہ سیدھا راستہ ہے، جس کی ہدایت بالکل واضح ہے اور جس کی قدر و منزلت روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔)

اس طرح شاہ صاحبؒ نے قرآن وسنت سے اخذِ علم کے بنیادی اصول اور ضابطے پوری تحقیق سے مرتب کیے۔

علم السّیاسیۃ و الخلافۃ کی ترتیب وتدوین

اسی طرح شاہ صاحبؒ نے ان تمام علوم کی سمجھ کے لیے ''عـلـم السّیـاسۃ و الخلافۃ'' بھی مرتب اور مدوّن کیا۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''إزالۃ الـخـفاء عن خلافۃ الخلفاء'' لکھی۔ جس میں خلفائے راشدینؓ؛ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ کی خلافت کی روشنی میں سیاست اور خلافت کے امور متعین کیے۔ ان حضرات میں بھی وہ مرکزی شخصیت جن کے زمانے میں سسٹم اور ادارے بنے، وہ حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے امیرالمؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو مرکزی شخصیت قرار دے کر ''ازالۃ الـخفاء'' کی دو جلدوں میں گفتگو کی۔ اس حوالے سے حضرت عمر فاروقؓ کے دین اسلام کے تین بنیادی دائروں؛ شریعت، طریقت اور سیاست سے متعلق کیے ہوئے فیصلوں اور اقوال کو مستقل رسائل میں جمع کیا ہے۔

ا۔ رسالہ فقہ عمرؓ

شاہ صاحبؒ نے فقہ عمر پر ایک مستقل رسالہ ''تـدویـن مـذھـب الخلیفۃ الأوّاب النّاطق بالصّدق و الصّواب أمیر الـمؤمنین عمرؓ بن الخطّاب'' کے عنوان سے مرتب اور مدوّن کیا۔ اس میں شاہ صاحبؒ نے بتلایا کہ دراصل حضرت عمر فاروقؓ مجتہدِ مطلق مستقل ہیں، جب کہ چاروں فقہا؛ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ گویا کہ فقہ عمر کے مـجتھدینِ منتسبین ہیں۔ ان چاروں میں وہاں اختلاف ہوتا ہے، جہاں صحابہؓ کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور جہاں صحابہؓ کا اتفاق ہوتا ہے، یہ چاروں اُس پر متفق ہوتے ہیں۔ تو اجتماعیت کے نقطہ نظر سے شاہ صاحبؒ نے پوری فقہ مرتب اور مدوّن کردی۔

۲۔ رسالہ تصوفِ فاروقِ اعظمؓ

اسی طریقے سے شاہ صاحبؒ نے ایک رسالہ ''تصوفِ فاروقِ اعظمؓ'' لکھا، جس میں بہ قول شاہ صاحب: ''نشـرِ مقامات و اشـاعـتِ کـرامـات و بیـانِ حِـکـم و إفادات خلیفۂ اوّاب الـنّـاطـق بـالـحـقّ و الـصّواب أمیر المؤمنین عمرؓ بن الـخـطـاب'' کا بیان ہے۔ اس رسالے میں بہت ہی نئی اور اہم باتیں کہی ہیں، جو طریقت کے حوالے سے شاہ صاحبؒ سے پہلے

کسی صوفی نے نہیں کہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس میں یہ بات بھی واضح کی کہ سلسلۂ تصوف کے بانی بھی دراصل حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ تصوف کی جو بنیاد سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ نے بتلائی، وہ یقین کی کیفیت کا پیدا ہونا ہے۔ نفس اور قلب کی طبیعت کو مہذب بنا کر یقین تک پہنچنے کے لیے شیخ ابوطالب مکیؒ نے ''قوت القلوب'' میں دس بنیادی مقامات بیان کیے ہیں، جن میں توبہ، زہد، صبر، شکر، رجاء، خوف، توکل، رضا، فقر اور محبت شامل ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان دس مقامات اور یقین کی کیفیات کو منطوقِ قرآن حکیم، احادیثِ نبویہ سے کیسے اخذ کیا اور اس کے مطابق اُن کی سیرت اور کردار کیا رہا۔ اس طرح تصوفِ عمرؓ کو انھوں نے مرتب اور مدوّن کر دیا۔ شاہ صاحبؒ کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ کے نائب حضرت عثمان غنیؓ، پھر علی المرتضیٰؓ ہیں۔ اور کوفہ میں ان کے نائب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ ان کے بعد ان کے نائب حضرت یزید بن اسود نخعیؒ اور حضرت علقمہ بن قیسؒ ہیں۔ پھر اُن کے نائبین حضرت ابراہیم نخعیؒ اور حضرت فضیل بن عیاضؒ وغیرہ ہیں۔ پھر حضرت علیؓ سے آگے جو اُن کے خلفا یا شاگرد ہیں، ان کے واسطے سے سلسلہ بیان کیا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ کو انھوں نے حضرت انس بن مالکؓ کا تربیت یافتہ قرار دیا ہے۔ اور پھر اس واسطے سے حضرت جنیدِ بغدادیؒ تک پورا سلسلہ بیان کیا ہے۔

(یہاں پر ہم اختصار سے کام لیتے ہیں۔ چوں کہ علم تصوف ایک مستقل علم ہے، کسی موقع پر انشاء اللہ تفصیلی گفتگو کریں گے کہ شاہ صاحبؒ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں سلوکِ عمرؓ کا ایک نیا پہلو علمی بنیادوں پر واضح کیا ہے۔)

۳۔ رسالہ سیاستِ عمرؓ

شاہ صاحبؒ نے ''إزالۃ الخفاء'' میں ایک تیسرا رسالہ سیاستِ عمرؓ پر لکھا ہے، جس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ:

''فھٰذہٖ کلمات أمیر المؤمنین عمر بن الخطّاب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہٗ فی سیاسۃ الملک و تدبیر المنازل و معرفۃ الأخلاق.'' (55)

شاہ صاحبؒ نے اس رسالے میں حضرت عمر فاروقؓ کے سیاسی اقوال اور سیاسی حکمت سے متعلق امور بیان کیے ہیں، سیاسی اور معاشی حوالے سے اُن کی آرا کو جمع کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے بتلایا کہ معاشی نقطہ نظر سے کون کون سے قوانین حضرت عمر فاروقؓ نے متعارف کرائے اور سیاسی نقطہ نظر سے کون کون سی حکمت آمیز باتیں بیان کی ہیں، وہ تمام اقوالِ عمرؓ ایک جگہ پر جمع کر دیے ہیں۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں علم دین کا ایک مستقل ڈھانچہ کھڑا کیا۔ اور پھر اسے ''خلافتِ راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ'' یا ''خلافتِ خاصہ'' قرار دیا۔ اس کے بعد خلافتِ عامہ کا ایک تصور دیا، جو خلافتِ بنواُمیہ سے شروع ہو کر خلافتِ بنوعباس اور خلافتِ بنوعثمان تک دین اسلام کی حکمرانی کا پورا خاکہ شاہ صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ اس وقت اس پر گفتگو کریں تو بہت سا وقت اس پر لگ جائے گا۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع کا طالب ہے، جس پر گفتگو کی جاسکتی ہے کہ خلافت اور حکومت کیا ہے؟ خاص طور پر آج اس دور میں ''خلافت و ملوکیت'' کے نام سے بھی اور ''خلافت بہ مقابلہ جمہوریت'' کے نام سے بھی کچھ غیر منطقی اور غیر علمی باتیں اسلام کے نام سے کہی جارہی ہیں۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ کا نقطہ نظر بہت جامع، دوٹوک، قطعی اور منطقی (Logical) ہے۔

علمِ اَسرارِ دین کی تدوین وترتیب

شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کام میں ''الجادة القويمة المحمدية'' کے بعد ''علمِ اَسرار دین'' کی اہمیت ہے۔ یہ ایک مستقل علم ہے۔ اس علمِ اَسرارِ دین میں شاہ صاحبؒ نے دین اسلام اور دیگر جتنے مکتبہ ہائے فلسفہ وفکر ہیں، ان کی روشنی میں بھی انسانی ترقی کے قواعدِ کلیہ کا تعین کیا ہے، اور پھر ان قواعدِ کلیۂ مسلمہ سے جو ذیلی اور ضمنی قوانین وجود میں آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جو سیاسی، معاشی، سماجی سسٹم بنتا ہے، اس پورے مجموعے کا نام علم اسرارِ دین ہے۔

ہم انشاء اللہ کل کے موضوع میں تفصیل سے گفتگو کریں گے کہ خود علم اسرارِ دین کیا ہے، اس میں شاہ صاحبؒ نے بتلایا کہ کائنات کیا ہے؟ اس سے متعلق بنیادی حقائق کیا ہیں؟ اس کائنات میں انسان کیا ہے؟ انسان کی حقیقی اور ذاتی حقیقت کیا ہے؟ اس انسان سے پھوٹنے والے اعمال کیا ہیں؟ ان اعمال کے خواص واثرات کیا ہیں؟ ان خواص واثرات کے تناظر میں کون سا حکم اور قانون ہونا ضروری ہے؟ اور کون سا حکم اور قانون انسان کے عمل یا انسانیت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کا ایک منطقی اور مربوط ڈھانچہ علم اسرارِ دین کی شکل میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انسانوں کے سامنے رکھا ہے۔

علم تطبیق الآرا کی ترتیب وتدوین

شاہ صاحب پہلے فرد ہیں، جنھوں نے یہ علم تطبیق الآرا دریافت کیا۔ انھوں نے چوں کہ ان تمام علوم —— علوم القرآن، علوم الحدیث، علوم الفقہ، علوم التصوف اور علم الحقائق —— میں جمع وتطبیق کے لیے اس علم کو بنیاد بنایا، اس لیے اس علم کے قاعدے اور ضابطے مرتب اور مدوّن کرنے کی ضرورت تھی۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اس علم کے قواعد وضوابط اپنی کتاب ''تكميل الاذهان'' میں بیان کیے۔ اس کتاب کے چوتھے باب ''الباب الرابع فی تطبيق الارا'' میں اس فن کی تعریف، موضوع، غرض وغایت، اس کے قاعدے اور ضابطے مرتب اور مدوّن کیے ہیں۔ اسی کے متعلق ایک بحث مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ نے ''العبقات'' میں کی ہے۔ عبقات بھی تصوف کے اہم مسائل پر اسی علم تطبیق الآرا سے متعلق ہے، جس میں تطبیق کے ایک اہم ترین پہلو ''تجلی'' پر بڑی تفصیلی گفتگو حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حقائق کائنات کے تناظر میں کی ہے۔

وقت کی کمی کے باعث علم تطبیق الآرا کے حوالے سے بنیادی اور مختصر سی بات عرض کروں گا۔ حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اس حوالے سے بڑی بنیادی سی بات یہ کہی ہے کہ تطبیق سے یہ مراد قطعی طور پر نہیں ہے کہ کسی بھی معاملے میں مختلف دو آرا آئی ہوں تو تطبیق دیتے وقت ان میں سے کسی ایک رائے کو بالکل غلط قرار دیا جائے، یا کسی ایک رائے پر مبنی دعویٰ کی نفی کر دی جائے، اسی طرح دونوں آرا کو ایک ہی اصول سے پھوٹنے والی دو شاخیں قرار دینا بھی تطبیق کا مقصد نہیں ہے۔ یہ بھی تطبیق کا مقصد اور مراد نہیں کہ ایک کا قول دوسرے پر منطبق کیا جائے اور دوسرے کا قول پہلے پر منطبق کیا جائے اور ان کی اصل رائے کو مسخ کر دیا جائے۔ تطبیق کا مفہوم شاہ صاحبؒ نے یہ واضح کیا ہے کہ کائنات کے حقائق، انسانیت کے حقائق اور گرد وپیش کی سوسائٹی کے حقائق ''واقع'' کے مطابق معلوم کیے جائیں۔ ان کا تعین بالعَيان أو البُرهان، یعنی عقلی طور پر اور مشاہدے کے بعد کیا جائے۔ اور متعلقہ معاملے کے حقائق کا تعین کرنے کے بعد اختلافی آرا میں سے کسی رائے کے بارے میں یہ دیکھا جائے کہ وہ متعین کردہ حقائق کے کس قدر قریب واقع ہوئی ہے اور کس قدر حقائق سے انحراف کیے ہوئے ہے۔ یعنی اصل حقائق سے وہ رائے کس قدر

www.rahimia.org

دور ہے یا قریب ہے۔ یعنی پہلے اصل ''واقع'' کا تعین کرنا اور پھر اس واقع کے تعین کے بعد مختلف آرا کا تحلیل و تجزیہ کرکے اس رائے کا کون سا پہلو درست ہے اور کون سا غلط ہے؟ اس کا تعین کرنا اس حوالے سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ کی اصل عبارت اس طرح سے ہے:

''لیس المراد بالتّطبیق نفی دعویٰ مخالفۃ أحد الخصمین للآخر، و لا حمل کلام احدھما علیٰ مراد الآخر، و لا دعویٰ مطابقۃ اُصول مذھب کُلّ و فروعہٖ علی الواقع، بل ھو: ''عبارۃ عن معرفۃ قدر انطباق کل مذھب مع الواقع، و قدر انحرافہٖ عنہُ، و معرفۃ سبب الانحراف، بحیث یتفطّن لہُ من کلامہٖ و اصولہٖ و فروعہٖ، حتیٰ یطمئنّ القلب و یزول الرّیب.'' (56)

(علمِ تطبیق سے مراد یہ نہیں ہے کہ کسی ایک فریق کے دوسرے فریق کی مخالفت میں کیے گئے دعوے کا سِرے سے انکار کرنا ہے، اور نہ ہی ایک فریق کی گفتگو کو دوسرے فریق کی مراد پر محمول کرنا ہے، اور نہ ہی ہر مذہب کے اصول و فروع کے واقع کے مطابق ہونے کے دعوے کو قبول کرنا ہے۔ بلکہ اس سے مراد (اس علم کے) امرِ واقعی (متعین کرتے ہوئے، اس) کے ساتھ ہر مذہب کی مطابقت رکھنے والی مقدار کی معرفت حاصل کرنا۔ یہ کام کچھ اس طرح کرنا کہ جو اُس کے اپنے کلام اور اُس کے اصول و فروع سے سمجھ میں آتا ہو، یہاں تک کہ دل مطمئن ہو جائے اور شک دور ہو جائے۔)

شاہ صاحبؒ نے یہ علم مرتب کرکے فلاسفہ یونان کے فلسفیانہ افکار کی اصل حقائق اور واقع سے انحراف کی حالت کو واضح کیا ہے۔ ان میں کوئی پہلو درست یا صحیح ہے تو اس کا تعین بھی کیا ہے۔ اسی طرح دیگر تمام شعبوں جن میں تصوف کا شعبہ ہے، علم الحقائق کا شعبہ ہے، فلسفے کا شعبہ ہے، فقہی اختلافات ہیں، احادیث سے متعلق اختلافات ہیں، تفسیری اختلافات ہیں، ان تمام شعبوں کی ایک ایک دو دو مثالیں شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اپنے اس رسالے میں بیان کی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک وسیع ترین علم ہے۔ اس سے ''**علم الجمع بین المختلفات**'' کا ایک حقیقی خاکہ سامنے آتا ہے۔ یہ تطبیق الآرا کا علم ہو تو اس سے بات کو درست تناظر میں سمجھنے کی کیفیت اور حالت پیدا ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں فکرِ ولی اللّٰہی کی ضرورت کیوں؟

یہ شاہ صاحب کی شخصیت اور اُن کے علوم و افکار کا ایک اجمالی سا خاکہ ہے۔ اب ہم تھوڑی سی گفتگو اس پر کرلیں کہ آج اس دور میں یعنی عصرِ حاضر میں اس ولی اللّٰہی فکر کی ضرورت کیوں ہے؟ شاہ صاحبؒ کے فکر کی ضرورت اس لیے ہے کہ آج ہمارے ہاں فکری انتشار کی تقریباً وہی حالت ہے، جو حالت شاہ صاحبؒ کے زمانے میں تھی۔ آج ہمارے زمانے میں بھی گزشتہ دو ڈھائی سو سال سے جاری سیاسی عدمِ استحکام اور غلامی کی وہی حالت ہے، جو شاہ صاحبؒ کے زمانے میں تھی۔

معاشی نقطہ نظر سے ویسا ہی طبقاتی نظام اور ویسا ہی لوٹ کھسوٹ کا عمل جاری ہے، بلکہ وہ لوٹ کھسوٹ کا عمل انگریزوں کے زمانے میں زیادہ سائنٹفک طریقے سے شروع ہوگیا تھا کہ جب ہندوستان —— جو سونے کی چڑیا تھی —— کی دولت لوٹ کر دریائے ٹیم (River Team) کے کنارے برطانیہ پہنچا دی گئی۔ ہندوستان میں انگریز آئے تو یہ خوش حال ترین ملک تھا اور جب انگریز گئے تو برِعظیم پاک و ہند کے دونوں ملک مقروض ترین ملک بن گئے۔

اس کے بعد کے ستر سالوں میں آج ہماری جو فکری، سیاسی اور معاشی حالت ہوچکی ہے، اس کا تجزیہ کریں تو ہمارے ہاں

www.rahimia.org

فکری انتشار ہے، سیاسی عدمِ استحکام ہے، معاشی و اقتصادی تباہی و بربادی ہے۔ سماجی حالات کی خرابی ہے۔ علم وفکر کی حالت یہ ہے کہ آج ہم اہلِ علم فرقوں میں تقسیم ہوکر ایک دوسرے کو کافر بنانے، سوسائٹی کو انتشار میں مبتلا کرنے، جاہلانہ حرکتیں کرنے، ایک دوسرے کی گردن مارنے اور مذہب فروشی کے کام کر رہے ہیں۔ جب کہ دنیا کی ظالم قومیں اس بات کا بہ بانگِ دُہل اعلان کر رہی ہیں کہ: ''ہم نے مذہب کو چھوڑ کر ترقی کی ہے۔ مذہب جہاں بھی ہوگا، وہ انتشار کا باعث بنے گا۔ تباہی و بربادی لائے گا۔'' سرمایہ داری نظام والے کہتے ہیں کہ ہم نے مذہب کو چھوڑ کر ترقی کی ہے۔ سوشلسٹ بھی یہی کہتے ہیں۔ اب آپ بتلایئے کہ ایسے ماحول میں جہاں خود ہمارے اپنے عمل و کردار نے اور غیروں کی یلغار نے ہمارے دین اور مذہب کو تنقید کا نشانہ بنایا ہوا ہے، وہاں دین اور مذہب کی وہ علمی جامع تعلیم اور مکمل فکر و فلسفہ جو سوسائٹی میں وحدت پیدا کرنے، سوسائٹی کی سیاسی، معاشی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک بنیادی کردار ادا کرنے والا جامع فکر ہے، ہم متلاشیانِ علم کو تو ضرور اسے سیکھنا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ عوام؛ اہلِ علم کی علمی باتیں نہیں سمجھ سکتے، لیکن ہم اہلِ علم وفکر کی تو یہ فلسفہ وفکر ضرورت ہے۔ اگر ہم اپنی دین کے ساتھ وابستگی کا اعلان کرتے ہیں، دین کے نام پر اس ملک کے بنانے کے دعوے کیے گئے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دین کا ایک مربوط علمی بیانیہ کیا ہے؟ اس کا ایک مکمل علمی فکر کیا ہے؟ آج تو ہمارے ملک میں یہ مخمصہ پیدا کر دیا گیا کہ دین کا اصل بیانیہ کیا ہے؟ اور پھر اپنے خود ساختہ بیانیے کے نام پر انتشار پیدا کرنا، انفرادی رائے قائم کرنا اور ایک دوسرے کے خلاف فتوے بازی کا ماحول بنانا سوسائٹی کی بہت بڑی تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکر؛ دین کا ایک صحیح، جامع اور مکمل بیانیہ واضح کرتا ہے۔ یہ نہ صرف بیانیہ ہے، بلکہ اس کا علمی تجزیہ، فکر وفلسفہ، عملی نظام اور ایک مربوط ڈھانچہ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اس جامع فکر وعمل کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین!

سوالات وجوابات

سوال: حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دیگر مکاتبِ فکر کے حوالے سے، دیگر فقہا کے حوالے سے اتنا عمدہ کام کیا ہے، لیکن ہمیں اس کا ظاہری اطلاق (Implementation) نظر نہیں آ رہا۔ ان کی فکر کو اس طرح سے پذیرائی نہیں ملی۔ یا لوگوں نے اس کو اس طرح سے قبول (Accept) نہیں کیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مختصر جواب اس کا یہ ہے کہ اس کی وجہ باہر سے آنے والی طاقت کی غلامی کا دور شروع ہوجانا ہے۔ جب قوم غلام ہوجاتی ہے تو اپنے فیصلے خود کرنے کی اہلیت سے محروم ہوجاتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یہ کام جس زمانے میں کیا کہ اس وقت غلامی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ان کی تحریک پر اگر عمل ہوتا اور مسلمان اس وقت جاگ جاتے اور اپنی آزادی برقرار رکھتے اور ہندوستان غلام نہ ہوتا تو ضرور نتائج مختلف ہوتے، لیکن جب غلامی شروع ہوگئی۔ اپنے فیصلوں پر آپ کو اختیار نہیں رہا۔ یہ اختیار

دوسروں کے پاس چلا گیا۔ تو پھر شاہ صاحبؒ سے پہلے کے علم کے پُرانے اور فرسودہ طریقے آگے آ گئے۔ اس سے شاہ صاحبؒ کا علمی وفکری مکتبِ فکر دب گیا۔ اس کی وَجہ(reason) آگے بیان ہو رہی ہے۔

آپ دیکھئے کہ جب1762ء میں بنگال اور اُڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس گئی۔ مغل حکمران شاہ عالم کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے میں ایک شِق لکھی گئی کہ عدالتی اور قانونی نظام دینِ اسلام ہی کا رہے گا، منصبِ عدالت پر علما اور قضاۃ برقرار رہیں گے۔ جب انگریزوں نے ان صوبوں کی مالیاتی اور دیوانی وصولیات اپنے قبضے میں لے لیں تو اب صوبوں میں عدالتی نظام قائم کرنے کے لیے علما کو بھرتی کرنے کا معیار بنانا پڑا۔ اس پر انھوں نے طے کیا کہ علما وہ ہوں گے، جو فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسۂ فکر کے پُرانے طریقے کے مطابق درسِ نظامی پڑھے ہوئے ہوں۔ وہ قاضی، مفتی اور جج بنیں گے۔

جب کہ شاہ صاحبؒ نے سو سال بعد اس پورے نصاب میں تبدیلی کی تھی۔ مدرسہ رحیمیہ کا نیا نصاب، تعلیم و تدریس کا اندازِ فکر اور نظام بنایا تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور اُن کے شاگردوں سے یہ علوم آگے پھیلے، لیکن حکومت میں جانے کا راستہ اس نصاب سے تو نہیں تھا۔ ملا نظام الدین سہالوی کے بنائے ہوئے فرنگی محلی مدرسۂ فکر کے نصاب میں صحاحِ ستہ نہیں تھیں تو اس میں احادیثِ مستفیضہ کا وہ ''جادۂ قویمہ'' کہاں سے ہوتا؟ جسے شاہ صاحبؒ نے متعین کیا تھا۔ وہاں تو صرف فقہ اور اصولِ فقہ اور حدیث میں تبرک کے لیے محض ''مشارق الانوار'' یا ''مشکوٰۃ شریف'' پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ تو حدیث پر بحث ہی کوئی نہیں تھی۔ قرآن حکیم کے حوالے سے ''تفسیرِ بیضاوی'' پڑھائی جاتی تھی، جس میں قرآن حکیم کا کوئی تفصیلی تعارف تو درکنار بلکہ تفسیر کے نام پر پہلے پارہ کے ایک پاؤ کے اندر ہی سارا سال گزار دیتے ہیں۔ ہمارے مدرسوں کا نصاب آج بھی وہی چل رہا ہے۔

1857ء میں جب انگریزوں نے یہاں مکمل قبضہ کر لیا تو انھوں نے آتے ہی وہ سب ختم کر دیا کہ جی اب کسی مولوی اور عالم کو عدلیہ میں بھرتی نہیں کیا جائے گا۔ 1835ء میں لارڈ میکالے نے جو نیا نظامِ تعلیم بنایا، اُس میں اُس نے کہا کہ جو عربی اور فارسی پڑھے ہوئے ہیں، وہ تو عالم ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کو کسی منصبِ قضا اور عدالت پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔ اور جو پُرانے چلے آ رہے تھے، تو ان کو1857ء میں قتل کر دیا گیا۔

اب آپ دیکھئے کہ اس طرح ولی اللّٰہی مدرسۂ فکر پورے سو سال آگے نہیں بڑھ سکا۔ کیوں کہ سرکار کی مداخلت اور ملازمت کا حصول تعلیمی نظام کا مقصد رہا۔ 1857ء کے بعد وہ رہی سہی کسر بھی ختم ہو گئی۔ حدیث کا بھی وہی طریقہ جو پُرانا تھا، وہی چلتا رہا۔ تاہم جب دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ ولی اللّٰہی فکر پر مدرسہ رحیمیہ دہلی کا نصاب یہاں لائے۔ یہ نصاب ابتدائی پچاس سال تک وہاں رہا۔ اس کے نتیجے میں کچھ علما تیار ہوئے؛ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا سیّد حسین احمد مدنی یا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ تک، جنھوں نے اس علم کو بھی پڑھا اور اُس درسِ نظامی کی قیل و قال بھی پڑھی، تاکہ مروّجہ طریقے کے مطابق بھی وہ عالم ہوں اور ولی اللّٰہی مدرسۂ فکر بھی ان کے سامنے رہے۔

اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم نے ہر آدمی کو اجازت دے دی کہ وہ جیسا چاہے مدرسہ بنائے اور اُس کے اوپر ''جامعہ'' کا بورڈ لگا لے، چاہے اس میں حفظ کی کلاس ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ اسے بھی یونیورسٹی قرار دے دیا۔ جب کہ عصری یونیورسٹیوں میں ہمارا علمی ماحول یہ ہے کہ وہاں بس علومِ اسلامیہ کے کچھ خلاصے تو بیان کیے جاتے ہیں، لیکن پورا علمی

اور فکری مربوط جو نظام تھا، یا اس کی تحقیق و تدوین کا جو عمل ہے، وہ پسِ پشت چلا گیا۔ درست تعلیم کے پھیلنے کے لیے تو باقاعدہ مستحکم نظام اور آزادی و حریتِ فکر کی رائے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ افکار میں ایک انتشار کی حالت ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اور یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ہماری فکر متحد ہوجائے۔ اور پھر اس وقت بڑے بڑے لوگ جو ''خلافت بمقابلہ جمہوریت'' کے لیے نعرہ زن ہوں تو کیسے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو سکتے ہیں؟ شاہ صاحبؒ کے جو افکار آپ نے بیان کیے ہیں، ان پر ہم علمی طور پر کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ اہلِ علم اس کی ضرورت محسوس کریں کہ ہمیں واقعتاً اپنی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے بنیادی اساسی امور پر متفق ہونا چاہیے۔ اور اس اتفاق کے لیے ہمیں ان ولی اللّٰہی علوم کو اس تناظر میں پڑھنے کی ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم وحدت یا اتحادِ اُمت کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں یہ آتا ہے کہ اس اتحاد اور وحدتِ فکر میں تمام لوگوں کی جزوی یا انفرادی آرا ختم ہوجانی چاہئیں؟ سب کے سب ایک ہی رائے اور ایک بات پر اکٹھے ہوں تو پھر تو اتحادِ اُمت ہے، ورنہ نہیں۔ دیکھیں! اتحادِ اُمت کا یہ تصور بھی غلط ہے۔ بنیادی اساسی امور میں اتفاق ہوتا ہے۔ ان میں کسی فرقے کا عموماً کوئی اختلاف نہیں۔ کیا عبادات میں ہمارا کوئی اختلاف ہے؟ پانچ اوقات کی نمازوں، روزے، حج اور زکوٰۃ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ایک نے ایک صحابی (حضرت ابن عمرؓ) کی روایت پر عمل کرکے رفع یدین کو ضروری قرار دے دیا اور ایک نے کسی دوسرے صحابی (حضرت ابن مسعودؓ) کی روایت کی بنیاد پر کہا کہ رفع یدین نہیں ہونا چاہیے۔ تو یہ اختلاف بُرا نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ ''یہ اختلاف جادۂ قویمہ کے خلاف نہیں۔'' وقت کی کمی کی وَجہ سے یہاں اس کی مثالیں نہیں دی جاسکیں، لیکن شاہ صاحبؒ نے ''التّفھیمات الإلٰھیہ'' میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں کہ جادۂ قویمہ کے اندر رہتے ہوئے صحابہؓ کے اختلافات ٹھیک ہیں، لیکن جادۂ قویمہ کے دائرے سے باہر جو اختلافات ہیں، اسی سے دراصل انتشارِ فکر پیدا ہوتا ہے۔

اسی طریقے سے مثلاً سیاست ہے۔ کیا سیاست میں امن اور عدل پر ہمارا کوئی اختلاف ہے؟ کسی بھی سمجھ دار انسان کا کوئی اختلاف نہیں۔ عمل درآمد کے حوالے سے مختلف جزوی آرا ہوسکتی ہیں اور وہ ہونی بھی چاہئیں کہ اُسی سے چیزیں آگے بڑھتی ہیں۔ ایسے ہی معاشی حوالے سے بھی کچھ بنیادی امور پر ہمارا اتفاق ضروری ہے۔ جب کہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ کچھ علمی معاملات تو ہمارے پیشِ نظر ہوتے ہیں، لیکن سیاست، معیشت اور سماجیات، جیسے شعبے ایسے ہیں کہ بدقسمتی سے ہم اہلِ علم نے اس پر پورے طور پر مکالمہ نہیں کیا۔ اور ان کو موضوع بنا کر ان پر گفتگو نہیں کی۔ ہر آدمی نے انفرادی طور پر جو کچھ اس کا مطالعہ ہوا، اس مطالعے کے زور پر ایک کتاب لکھ دی اور ایک نیا مکتبہ فکر وجود میں آ گیا۔

اس پر ہمیں گفتگو کرنی چاہیے کہ جو جادۂ قویمہ ہے، یعنی منطوقِ قرآن، احادیثِ مستفیضہ، کبار صحابہ کا اجماعی عمل، اور احادیثِ حسن اور صحیح کے تناظر میں ہمارا سیاسی مؤقف کیا ہونا چاہیے۔ اس کی عملی شکل کیا ہو؟ عملی شکلوں میں اختلافِ رائے ہوسکتا ہے۔ اسی طرح معاشی حوالے سے صورتِ حال ہے۔ ایسی علمی باتیں ہم شروع کریں گے تو بات آگے بڑھے گی۔ اس وقت اگر ہم یہ کہیں کہ ولی اللّٰہی فکر پر مبنی یہ علوم پڑھے بغیر سارے لوگوں کو متحد کرلیں تو اس وقت میرا خیال ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

سوال: میں نے کوشش کی درسِ نظامی پڑھنے کی، تین چار مدارس ہمارے ہاں درسِ نظامی پڑھا رہے ہیں۔ میں نے سبھی میں اپنا داخلہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ تم کلین شیو (clean shaved) ہو۔ تم مذہب کے معیار پر پورے نہیں اُترتے ہو۔ تمھیں ہم

یہ داخلہ نہیں دے سکتے۔ تم پہلے یہ داڑھی بڑھاؤ، پھر تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنا۔ ورنہ(othervwise) تم اس قابل نہیں ہو۔ میرے پاس ان کا جواب بھی لکھا ہوا پڑا ہے۔ ہم جو سکول و کالج میں پڑھنے والے لوگ ہیں، تو ہم دین کے لحاظ سے جاہل ہوتے ہیں۔ جو ہمارے مدرسوں کے پڑھنے والے لوگ ہوتے ہیں، انھیں انگریزی اور جو دوسرے عصری علوم ہیں، وہ نہیں آتے۔ وہ اپنے طرزِ عمل پر قائم ہیں۔ تو ہم کوشش کر کے ان دونوں کو اگر ایک کر کے کوئی ایک ایسا نظام کیوں نہیں بنا پائے یا کیوں نہیں بنا سکتے کہ جس میں اگر میں گریجویشن کر کے نکلوں تو میں اپنے دینی معاملات کو بھی ہینڈل کر سکوں اور عصری معاملات میں بھی میں اپنے آپ کو آگے لے جا سکوں۔

جواب: ہم بھی آپ کے ساتھ متفق ہیں کہ یہ ہمارے معاشرے کی خرابیاں ہیں، جس میں ابھی تک ہمیں اہلِ علم ہونے کے باوجود علم اور جہل کا نہیں پتہ چلا۔ اس سلسلے میں ہم کسی بھی شعبے کے عالم ہونے کے باوجود اس دوئی کے نظام سے نہیں نکلے۔ مسلمانوں کے غلبے کے زمانے میں اور پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانے تک بھی ایسا رہا ہے کہ علم کا ایک ہی مرکز ہوتا تھا۔ اس علم کے مرکز سے علما بھی نکلتے تھے، صوفیا بھی نکلتے تھے، انجینئرز بھی نکلتے تھے، حکمران بھی پیدا ہوتے تھے۔ اور فزکس، کیمسٹری اور طبیعات کے ماہرین اور سوشیالوجی کے ماہرین بھی نکلتے تھے۔ یہ جو عصری اور دینی حوالے سے تقسیم ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے تعلیم کے حصول اور دیگر شعبوں کے حوالے سے جو خود ساختہ معیارات بنا لیے ہیں، یہ بھی ہماری غلامی کے زمانے کے ہیں۔ جب یہاں ہم دو سو سال تک انگریزوں کے غلام رہے تو لارڈ میکالے نے آ کر یہاں کا نظامِ تعلیم نئے خطوط پر استوار کیا، اس کے بعد سے اُس نے یہ عصری اور دینی تعلیم کی تقسیم کھڑی کی۔ اور پھر اس کی بنیاد پر ہی یہ سکولوں، کالجوں اور مدرسوں اور مسجدوں کا ایک خود ساختہ نظام بنا۔ جس کی وجہ سے آج غلامی کے ستر سال گزرنے کے باوجود بھی ہم اس تقسیم سے دوچار ہیں۔

ہمارے ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کا تو بنیادی پیغام ہی یہ ہے کہ مدرسے اور کالج کی یہ تقسیم ہمارے اندر سے ختم ہونی چاہیے۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے بڑے فاضل شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ — جو دیوبند کے پہلے طالبِ علم بھی تھے — وہ سب سے پہلے خود علی گڑھ یونی ورسٹی چل کر آئے، حال آں کہ وہ یونی ورسٹی انگریزوں کی بنائی ہوئی تھی اور اُن کے زیرِ اثر تھی۔ سرسیّد صاحب نے سیاسی طور پر انگریزوں کی حمایت کا اعلان بھی کیا تھا۔ دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان تضاد بھی تھا، 1919ء میں خود شیخ الہندؒ وہاں پہنچے اور حضرتؒ نے فرمایا کہ:

> ''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار — جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں — مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو مَیں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ (کالج) کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں — مدرسۂ دیوبند اور علی گڑھ کالج — کا رشتہ جوڑا۔''(57)

اس طرح حضرت شیخ الہندؒ نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی تفریق کو ختم کیا۔ اسی طرح ہمارے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ فرماتے تھے کہ:

> ''یہ مسلمان نوجوان ہمارا اثاثہ ہے۔ سکول میں گیا ہے یا کالج میں گیا ہے، یا مدرسے میں ہے، اس کو دینی علم کا بنیادی شعور ہونا چاہیے۔ وہ کسی بھی شعبے میں کام کرے۔''

ظاہر ہے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ایک ڈاکٹر بیک وقت انجینئر بھی ہو اور بیک وقت مکمل عالم بھی ہو۔ یا جیسے کسی ایک عالم سے یہ تقاضا کرنا کہ وہ ایک وقت ڈاکٹر اور انجینئر بھی ہو، تو یہ غیر منطقی بات ہے، لیکن کم از کم جو بنیادی سماجی علوم ہیں، ان پر تو انسانی بنیادوں پر سب متفق ہوں۔ یہ ضرور ہونا چاہیے اور اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس دو رُخے نظامِ تعلیم سے ہٹ کر علم کی اساس پر اپنے نظامِ تعلیم کو پرکھیں۔ اور انسانیت کی بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب خدمت کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہوں۔

سوال: آپ نے بتایا کہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے پچاس سال تک شاہ صاحبؒ کے نصاب کے مطابق تعلیم دی گئی۔ شاہ صاحبؒ کے نصاب میں اور آج کل کے نصاب میں کیا فرق ہے؟

جواب: اس کے لیے بس آپ ایک کام کریں کہ ''تاریخِ دارالعلوم دیوبند'' —— جو حضرت قاری محمد طیب قاسمیؒ نے لکھوائی ہے، سیّد محبوب رضوی کی لکھی ہوئی ہے —— میں وہ قدیم نصاب بھی موجود ہے اور جو آج کل آپ پڑھ رہے ہیں، آپ کے پاس بھی وہ نصاب موجود ہے، دونوں کا موازنہ کرلیں کہ دونوں کے درمیان کیا فرق ہے۔

سوال: برصغیر کی ایک خصوصیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ یہاں پر بہت سے مذاہب کے ماننے والے ہیں۔ ان کو آپس میں قریب لانا یا ان کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کاوشیں ہوتی رہی ہیں، جیسا کہ ہمارے ہاں اکبر بادشاہ نے بھی ان کو قریب لانے کی کوشش کی تھی۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ کا کیا طریقۂ کار ہے؟

جواب: شاہ صاحبؒ نے جب اپنے فلسفۂ فکر پر بحث کی ہے، اس کے لیے ایک کتاب ''البدور البازغہ'' لکھی ہے۔ ایک تو علما اور مسلمان اہلِ علم کو علم اسرارِ دین بات سمجھانے کے لیے ''حجۃ اللّٰہ البالغہ'' لکھی۔ دوسری کتاب جو اسی علم وفکر کو انسانی اصولوں پر سمجھانے کے لیے لکھی ہے، وہ ''البدور البازغہ'' ہے۔ اس کتاب میں ویدانت فلاسفی، وحدت الوجود فلاسفی یا وحدت الشہود کے ماننے والے یا فلسفہ یونان سے شغف رکھنے والے لوگوں کو یہی علمِ اسرارِ دین انسانی اصولوں پر سمجھایا ہے۔ اس کتاب کے تین مقالے ہیں۔ اس کا مقدمہ اس حوالے سے بڑی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں انھوں نے جو مذاہبِ عالم ہیں، ان کے بنیادی تصورات اور ان کے مسلمات کی اصل حقیقت بیان کرتے ہوئے انھیں سمجھایا ہے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ درسِ نظامی کا نصاب پہلے رائج تھا، بعد میں وہ نہیں رہا۔ اب مدارس میں بھی اور کالجوں میں بھی نئے نصاب لانے کے حوالے سے دوبارہ بات ہورہی ہے۔ اگر نیا نصاب بنایا جائے تو اس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا کیا حصہ ہوگا۔

جواب: ہم نے تو آپ کے سامنے اس ولی اللّٰہی فکر کے نصاب کی پوری جامعیت اور اس کا ایک مربوط خاکہ رکھا ہے۔ فیصلہ سازی کرنے والے تو ظاہر ہے آپ کے مدارس کے وفاقات یا تنظیمات والے لوگ ہیں۔ یا حکومتی ادارے ہیں، جنھوں نے تعلیمی پالیسی بنانی ہے۔ وہ کس طرح اس کو قبول کرتے ہیں، یا قبول نہیں کرتے، اگر اُن کے اپنے کوئی تحفظات علمی طور پر ہوں تو بات کریں۔ اس پر تو ہم بات کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن انتظامی حکم نامہ تو ظاہر ہے جن کے قبضے میں انتظامات ہیں، انھوں نے کرنے ہیں۔

سوال: تو ہم درخواست کریں گے کہ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کے منتظمین سے کہ وہ کوئی ایسا نظام بنائیں اور ہم جیسے گریجویٹس کو موقع دیں کہ دینی تعلیم وتربیت کا یہ نصاب ہم پڑھ سکیں۔

جواب: جی ہم تو یہ کام کررہے ہیں اور انشاء اللہ ہمارے تو دروازے کھلے ہیں۔

www.rahimia.org

صدارتی کلمات

از ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب

(نوٹ: لیکچر اور سوال و جواب کے اختتام پر صدر شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان جناب ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے درجِ ذیل صدارتی کلمات ارشادفرمائے۔ مدیر)

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، و الّصلوٰۃ و السّلام علیٰ رسولہ النّبیّ الکریم، خاتم الأنبیاء و المرسلین. و علیٰ آلہٖ و أصحابہٖ و أھل بیتہٖ و ازواجہٖ أجمعین.

انتہائی قابل احترام جناب پروفیسر ڈاکٹر سعیدالرحمٰن صاحب، جنابِ مہمان مقرر مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب مدظلہٗ العالی اور انتہائی قابل احترام اساتذۂ کرام، طلبا و طالبات!

پہلی بات یہ ہے کہ اتنے جامع خطبے کے بعد اس پر اظہارِ خیال تو نہیں ہوسکتا۔ میں تو سب سے پہلے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جناب مفتی عبدالخالق آزاد صاحب نے گزشتہ دنوں (3/نومبر 2016ء کو) یہاں جب ہمیں ایک لیکچر دیا تھا، اس میں وعدہ کیا تھا کہ ''میں آئندہ بھی لیکچر دینے آؤں گا۔'' انھوں نے اپنے وعدے کو پورا کیا۔ میں شعبہ علومِ اسلامیہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی کی طرف سے تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دوسری بات یہ کہ یہ جو لیکچر سیریز ہے، حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر اور عصرِ حاضر میں اُن کے اطلاق پر یہ چار روزہ لیکچر ہیں۔ شعبہ علومِ اسلامیہ سے جو طلبا و طالبات یہاں بیٹھے ہیں، ان کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کچھ دوست احباب باہر سے بھی آئے ہیں، وہ بھی جانتے ہیں اور سننے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ میں اس جامع تفصیلی خطبے کے بعد اس پر دو جملوں میں بات کر کے ختم کرتا ہوں کہ آج کے حالات جو 1762ء میں حضرت شاہ ولی اللہ جہاں چھوڑ گئے تھے، آج پھر وہیں کھڑے ہیں۔ ان حالات میں اس فکر کو سمجھنا اور جو علم و فکر کی بات آزاد صاحب نے کی، اس کو جامع طور پر آپس میں ملانا کہ علم بھی ہو اور فکر بھی ہو اور اس کے ساتھ پھر عمل بھی ہو۔ تو جب یہ تینوں اجزا (components) علمی طور پر ہم لے آئیں تو ہمارے معاشرے کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

یہ نصاب میں آئیں، یہ کسی ادارے میں آئیں، یہ فکر و سوچ کے اندر آئیں تو پھر معاشرے کے اندر تبدیلی آئے گی۔ جو باتیں آزاد صاحب نے آج اپنے خطبے میں کہی ہیں، آپ اس کی عملی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اسی طرح، آزاد صاحب کا انداز بھی وہی تھا جو حضرت شاہ صاحب کا میں نے پڑھا۔ آپ نے بھی خود پڑھا ہوگا جو طلبا و طالبات یہاں بیٹھے ہیں، الفوز الکبیر تو پڑھی ہے نا سب نے۔ شاہ صاحبؒ کیا کہتے ہیں، جب کوئی

www.rahimia.org

مثال دیتے ہیں کہ آج اس کی تصویر آپ اپنے معاشرے میں دیکھ سکتے ہیں۔ آج فلاں طبقے کے اندر، میں نام نہیں لیتا، علمائے کرام بیٹھے ہیں، ناراض نہ ہوجائیں، تو آج فلاں طبقے کی تصویر یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ معاشیات کے حوالے سے، آج کے صنعت کار اور تاجر اور جو آج کے امرا طبقہ ہے، اس کے حالات آپ دیکھ سکتے ہیں۔

یعنی شاہ صاحبؒ نے جو فلسفہ علم دیا ہے، اس کو آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ان چار دنوں کے اندر۔ تو آپ لوگ خود بھی تشریف لائیں، اَوروں کو بھی لائیں، تو اس پر میں آپ سے یہ کہوں گا کہ جو طلبا و طالبات یہاں آئیں، وہ غور و فکر سے بیٹھیں۔ توجہ سے سنیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو علم اور فکر ہمیں دی، اور آج بھی ہمارا معاشرہ ستر سال پاکستان بنے ہوگئے ہیں اور اس سے پہلے جیسے مفتی صاحب نے ابھی بتایا کہ ان سارے حالات کے اندر آج ہم وہیں کھڑے ہوئے ہیں، جہاں پر ہم پہلے تھے، شاہ صاحبؒ کی زندگی میں تھے۔ اور شاہ صاحبؒ نے تبدیلی کے لیے وہ نصاب، وہ فکر، وہ سوچ، وہ علم ہمیں دیا، آج ہم اس علم سے فائدہ حاصل کریں۔

آج بھی وہی انتشار ہے معاشرتی سطح پر، سیاسی سطح پر، سماجی سطح پر، معاشی سطح پر آپ دیکھ چکے ہیں جو آپ کے سامنے ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ معاشرے میں اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سماجی سطح پر ہر بچہ و بچی جانتا ہے کہ میرے معاشرے میں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ علمی سطح پر ہمارا علم کتنا محدود ہے، یہ کلاس اور نوٹس کی حد تک ہے۔ تو پھر تبدیلی کیسے آئے گی؟ انتشار کا خاتمہ کیسے ہوگا؟ اور انتشار، مفتی صاحب ابھی کھل کر بات کر رہے تھے کہ ہم علم کو بھی بیچتے ہیں، علم فروشی بھی کرتے ہیں، مذہب فروشی بھی کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ والے سارے کام آج ہم کر رہے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ ہماری حالت بدل جائے۔ ہم ایک اُمت بن جائیں۔ ہمیں غلبہ دین حاصل ہوجائے۔ یہ خواب تو کسی دیوانے کا ہوسکتا ہے، کسی عقل مند آدمی کا نہیں ہوسکتا۔

مفتی صاحب نے علم اور عمل کی جو بات کی ہے، اور ماشاء اللہ اتنی تفصیلی باتیں کی ہیں، تو کل بھی لیکچر ہوگا، پرسوں بھی لیکچر ہوگا، اس کے بعد بھی ہوگا۔ تو آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ جب چار دن بعد اس ہال سے اٹھ کر جائیں تو کم از کم آپ میں تبدیلی آنی چاہیے۔ علمی اور فکری طور پر آپ کی سمت درست ہونی چاہیے۔ آپ کے اندر انتشار کم ہونا چاہیے۔ آپ اس معاشی، سماجی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو کر جائیں۔ ذہنی طور پر تیار ہوجائیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم یہاں پر داخلہ لیتے ہیں، پڑھتے ہیں، ڈگریاں لیتے ہیں، لیکن وہیں کھڑے ہوتے ہیں، جہاں تھے۔

میرے عزیز طلبا و طالبات! آپ سے درخواست ہے، علمائے کرام اور اساتذۂ کرام سے بھی درخواست کرتا ہوتا ہوں کہ آپ اس معاشرے کی اساس ہیں۔ آپ اس کا ورثہ ہیں۔ اس کی بنیادیں ہیں۔ اور اسی پر عمارت تعمیر ہونی ہے۔ تو آپ تبدیلی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔ اور فکرِ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ آج آپ کے سارے مسائل کا حل دیتا ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور و فکر کرنا شروع کردیں۔ اور اعتدال کے ساتھ اپنے معاشرے میں زندگی بسر کرنا شروع کردیں۔ تو یہ جو انتشار ہے اور اس انتشار کی جو صورتِ حال ہے، عالمی طور پر بھی، قومی اور بین الاقوامی طور پر

بھی، وہ دونوں ہمارے سامنے ہیں کہ آج اسلام کو کیا چیلنجز درکار ہیں۔ آپ کے سامنے ہیں کہ آج انتشار بھی ہے، لیکن مذہبِ اسلام کو اس طرح سے بدنام کیا جا رہا ہے۔

ہم مل کر ان چار روزہ لیکچر سیریز کے اندر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فکر اور عمل کا جو علم ہے، اسے بھی حاصل کریں اور اس کے بعد بھی اس سے اپنا تعلق قائم رکھیں۔ تاکہ ہمارے معاشرے کے اندر انتشار کم ہو سکے اور ہم اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکیں۔ ایسے سوالات جو آج معاشرے کے اندر ہو رہے ہیں، قومی طور پر بھی اور بین الاقوامی طور پر بھی، ان کا صحیح معنوں میں جواب دے سکیں۔

اس کے ساتھ میں جناب ڈاکٹر سعید الرحمٰن کا، موسیٰ پاک شہید چیئر کا بھی اور مفتی صاحب کا بھی، جو تمام لوگ باہر سے آئے ہیں، آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ شعبہ علومِ اسلامیہ کا یہ سٹیج، یہ ہال علم اور عمل کے لیے حاضر ہے۔ انشاء ایسے لیکچر اس کے بعد بھی ہوتے رہیں گے۔ بہت شکریہ۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ القرآن 57:25۔
2۔ صحيح بخاری. باب ما ذكر عن بنی إسرائيل. حديث 3455، طبع بیروت۔
3. صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب 53، حديث نمبر 4950۔
4۔ سنن ابو داؤد، كتاب الملاحم، حدیث نمبر: 4291۔
5۔ صحيح بخاری. باب ما ذكر عن بنی إسرائيل. حديث 3455۔
6۔ سنن ابو داؤد، كتاب الملاحم، حدیث نمبر: 4291۔
7۔ التفهيمات الإلٰهيه، تفہیم نمبر 15، ص 54، ج 1، طبع حیدر آباد۔
8۔ ایضاً۔
9۔ اصل حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''العلماء ورثة الأنبياء.'' (رواه ابو داؤد فی سننهٖ، كتاب العلم، حديث نمبر 3641. و رواه البخاری فی ترجمة باب العلم قبل القول و العمل)
10۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصل عبارت درجِ ذیل ہے:
''دراَخبار آمده ''العلماء ورثة الأنبياء'' علمے کہ از انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات باقی مانده است دو نوع است: علمِ اَحکام وعلمِ اَسرار۔'' (احادیث میں آیا ہے کہ: ''علما انبیاؑ کے وارث ہوتے ہیں۔'' انبیا علیہم السلام کا جو علم اُمت کے لیے اب بھی باقی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) علمِ احکام (شریعت) (۲) علمِ اَسرار (دین)
(مکتوبات امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ، دفتر اوّل، مکتوب نمبر 268، ص: 96-495۔ طبع: مطبع ایجوکیشنل، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی)
11۔ اس حوالے سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصل عبارت درجِ ذیل ہے:
''عالمِ وارثِ (پیغمبر) کسے است کہ اُورا اَز ہر دو نوعِ علم سہم بود، نہ آں کہ اُورا از یک نوع نصیب بود از انواعِ دیگر کہ آں منافیٔ وراثت است۔ چہ وارث را از جمیع انواعِ ترکۂ مورِث نصیب است، نہ از بعض دون بعض۔ و آں کہ اُورا از بعضِ معیّن نصیب است داخل غرماء

است کہ نصیبِ اُو بہ جنسِ حقِ اُوتعلق گرفتہ است۔ وہم چنیں فرمودہ علیہ وعلٰی آلہ الصلوٰت والسلام: ''علماء اُمّتی کأنبیاء بنی إسرائیل.'' مراد از علماء علمائے وارث اند، نہ غرماء کہ نصیبے از بعضِ ترکہ فرا گرفتہ اند۔ چہ وارث را بہ واسطۂ قرب وجنسیت ہم چوں مورث مے تواں گفت۔ بہ خلاف غریم کہ ازیں علاقہ خالی است۔ پس ہر کہ وارث نہ بود، عالم نہ باشد مگر آں کہ علم اُورا مقید بہ یک نوع سازیم و گویم کہ عالمِ علم احکام مثلاً۔ و عالمِ مطلق آں بود کہ وارث باشد و از ہر دو نوع علم اُورا نصیبِ وافر بود۔''

(پیغمبر کا وارث عالم وہ شخص ہے کہ جس کو ان دونوں علوم میں سے حصہ حاصل ہو۔ ایسا شخص نبی کا وارث نہیں ہے، جس کو ان علوم میں سے کسی ایک قسم کا علم حاصل ہو اور دوسری قسم کے علم سے بالکل ناواقف ہو۔ اس لیے کہ یہ وراثت کے خلاف بات ہے۔ وہ آدمی کیسا وارث ہے کہ اپنے مورِث کے ترکے کی تمام چیزوں میں سے اُسے کچھ حصہ حاصل ہو اور کچھ چیزوں کا حصہ باقی ہو۔ ایسا شخص نبی کا وارث عالم نہیں ہے، بلکہ علم کے قرض داروں میں داخل ہے کہ ابھی تو اُسے علمِ نبوت سے متعلق باقی حصے کا قرض چکانا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میری اُمت کے علما بنی اسرائیل کے انبیاؑ کی طرح ہیں۔''

(رواہ ابن العربی فی الفتوحات و ابونُعیم عن ابن عباس رفعه)

اس حدیث میں بھی علما سے مراد وہ علما ہیں، جو وارث ہوتے ہیں، نہ کہ علم کے مقروض کہ انھوں نے حضورؐ کے علمی ترکے کے کچھ حصے کو چھوڑ دیا ہو۔ اس لیے کہ وارث اپنے مورِث سے قرب اور تعلق کے حوالے سے مورِث کی طرح ہوتا ہے۔ بہ خلاف قرض دار کے، کہ وہ مورِث کا مقروض ہے، نہ کہ اُس کا وارث۔ پس جو وارث نہیں ہیں، وہ علم نبوت کے عالم بھی نہیں ہیں۔ ہاں مگر! اُس کا علم صرف ایک قسم میں بند ہے اور ہم اُسے مثلاً علمِ اَحکام کا عالم کہیں گے۔ مطلق عالم وہ ہوتا ہے کہ جو وارث ہو اور (حضورؐ کے) دونوں علوم سے اُسے وافر حصہ حاصل ہو۔)

پھر حضرت مجدد الفِ ثانیؒ علم اَسرار کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ولایتِ صوفیا کے اَسرار و رموز کے مقابلے پر انبیا علیہم السلام کے علم الاسرار کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''صوفیا کے اَسرار و معارف کی بنیاد وجد کی مستی اور غلبۂ حال کی وَجہ سے ہوتی ہے، جب کہ انبیا علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے تمام علوم، خواہ علمِ اَحکام ہوں یا علمِ اَسرار، سب کے سب عقل وشعور اور ہوش مندی کی حالت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اُن میں بے ہوشی اور بے شعوری کی کوئی حالت نہیں ہوتی۔'' (حوالہ بالا)

حضرت مجدد الفِ ثانیؒ نے اپنے اس مکتوب میں ایک عالمِ ربانی کے لیے علومِ نبوت میں علمِ احکامِ شریعت اور علمِ اسرارِ دین دونوں کی اہمیت واضح کی ہے۔ صرف شریعت کے احکامات کا عالم اور علومِ نبوت کی اساس پر علمِ اسرارِ دین سے ناواقف کو انبیاؑ کا وارث قرار نہیں دیا۔ ان دونوں علوم کے بغیر دینِ اسلام کے غلبے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

12۔ **القول الجلی فی مناقب الولی**، از حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی، ص11، اردو ترجمہ مولانا تقی انور علوی، طبع: خانقاہ کاکوری، ضلع لکھنؤ۔

13۔ ایضاً، ص343۔

14۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں: ''بالجملہ از فنونِ متعارفہ بہ حسبِ رسمِ ایں دیار پانزدہم فراغ حاصل شد۔ ...و از جملۂ مِنَنِ عظمٰی بریں ضعیف آں بود کہ چند بار در مدارسۂ قرآن عظیم با تدبرِ معانی و شانِ نزول و رجوع بہ تفاسیر بہ خدمتِ ایشاں (والدِ گرامی) حاضر شدم و ایں معنی سببِ فتحِ عظیم اُفتاد، والحمد للہ۔'' (انفاس العارفین (فارسی متن)، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص198، طبع: اسلامی کتب خانہ، کچہری روڈ، ملتان)

15۔ ایضاً، ص82۔ 16۔ ایضاً، ص200۔ 17۔ ایضاً، ص199۔

18۔ ایضاً، ص198۔ 19۔ ایضاً، ص199۔ 20۔ ایضاً، ص199۔

21۔ **القول الجلی فی مناقب الولی**، ص343۔ 22۔ القرآن 112:16 23۔ دیکھیے! القرآن 90:16

24۔ **الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النّفس**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص:142، طبع: گوجرانوالا۔

25۔ **التّفھیمات الإلٰھیہ**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، تفہیم نمبر 69، ج:1، ص:271۔

www.rahimia.org

26۔ ایضاً، ص: 282۔ 27۔ ایضاً، ص: 283۔
28۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب نمبر 20، ص 40، مرتبہ خلیق نظامی، مطبوعہ لاہور۔
29۔ ایضاً مکتوب نمبر دوم، ص 11۔ 30۔ ایضاً، ص 12۔ 31۔ ایضاً، مکتوب نمبر 2، ص: 10۔
32۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم، ص 221، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔
33۔ ایضاً، باب سیاست المدینہ، ص 94، جلد اول، طبع قاہرہ۔
34۔ ایضاً۔ 35۔ ایضاً، ص 22-221۔ 36۔ ایضاً، ص 220۔
37۔ ایضاً، ص 221۔ 38۔ ایضا، ص 221۔
39۔ مکتوبات امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مشمولہ کلماتِ طیبات، ص 158، مطبع مجتبائی، دہلی
40۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب نمبر دوم، مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص: 10، طبع: ادارہ اسلامیات لاہور۔
41۔ التّفہیمات الإلٰھیہ، تفہیم 243 (مکتوبِ مدنی)، ج: 2، ص 261۔
42۔ ایضاً، تفہیم نمبر 66، ج 1، ص: 208 تا 213۔
43۔ ایضاً۔
44۔ الفوز الکبیر فی اصول التّفسیر، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، الباب الرابع.
45۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب بیان ان اصل الدین واحد، ج 1، ص 251۔
46۔ ایضاً، باب انشاق التکلیف من التقدیر، ص 88-87۔
47۔ القرآن 72:33۔
48۔ القرآن 41:2۔
49۔ براھینِ قاسمیہ، از حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ص 123، بہ حوالہ ''العون الکبیر فی حل الفوز الکبیر''، ص 319، طبع: دیوبند۔
50۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب طبقات کتب الحدیث، ج: 1، ص: 375۔
51۔ التفہیمات الإلٰھیہ، تفہیم 66۔ ج 1۔ ص: 208 تا 213۔
52۔ ایضاً۔
53۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب کیفیۃ تلقی الامۃ الشرعۃ من النبی ﷺ، ص 73-372۔
54۔ التفہیمات الإلٰھیہ، تفہیم 66۔ ج 1۔ ص: 208 تا 213۔
55۔ ازالۃ الخفاء، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ج 4، ص 176، طبع قدیمی کتب خانہ، کراچی۔
56۔ تکمیل الأذھان، از شاہ رفیع الدّین دہلویؒ، الباب الرّابع فی تطبیق الآراء، ص 118، طبع: نصرۃ العلوم، گوجرانوالا۔
57۔ خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، تاسیسی اجلاس جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی منعقدہ ۱۶/صفر ۱۳۳۹ھ/ 29/اکتوبر 1920ء علی گڑھ

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ سیاسیات

اسلام میں سیاست اور ریاست کا تصور

تحریر: ڈاکٹر محمد ناصر

اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے۔ اس میں جہاں عبادات اور معاملات سے متعلق احکامات اور اُن کا عملی نظام موجود ہے، وہیں ملکی نظم و نسق، ریاستوں کی تشکیل اور سیاسی امور کی ادائیگی کے لیے بھی جامع ہدایات موجود ہیں۔ زیرِنظر مضمون میں دین اسلام میں سیاست اور ریاست سے متعلق بنیادی تصورات، تعلیمات اور اس سلسلے کے ضروری امور کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

سیاست کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ

سیاست بروزنِ ''اِمارت'' ہے، جو سَاسَ یَسُوْسُ سِیَاسَةً بروزنِ قَالَ یَقُوْلُ مصدر کا صیغہ ہے۔ اس باب کا مصدر سَوسٌ بروزنِ قَوْلَ بھی آتا ہے۔ سیاست اور سوس کے لغوی معنیٰ ''اصلاح کرنا اور سنوارنا'' ہے۔ گویا سیاست کسی چیز کی اصلاح کے لیے کمر بستہ اور کھڑے ہو جانے کو کہا جاتا ہے اور سیاست ایک مدبر اور قائد کا کام ہے۔ اسی مناسبت سے سائس اس شخص کو کہا جاتا ہے، جو سرداروں اور قائدین کی قوم سے ہو۔ لفظ سیاست اسی لغوی معنیٰ کی مناسبت سے حکومت و سیاست اور تدبیرِ مملکت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ علامہ ابن اثیرؒ (م:1233ء) کہتے ہیں:

''القیام علٰی الشّئی بما یصلح.'' (1) (ایک چیز کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا جن سے فساد ختم ہو جائے۔)

ابن منظور افریقیؒ (م:۷۱۱ھ/1311ء) لکھتے ہیں:

''و السّیاسة: القیام علٰی الشّئی بما یصلحه.'' (2)

(سیاست ایسی کوشش میں مصروف ہونا ہے، جو کسی چیز کو سدھارنے اور اس کی اصلاح کے لیے ہو۔)

گویا ''السّیاسة'' نام ہے تدبیر و انتظام کا ملکہ اور مہارت حاصل ہونا۔

سیاست کا اصطلاحی معنیٰ علمائے سیاست نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ ابوالحسن ماوردی (م:۴۵۰ھ/1058ء) کہتے ہیں:

''الإمامة موضوعةٌ فی حراسة الدّین و سیاسة الدُّنیا.'' (3)

(اِمامت کا لفظ دینی نظام کے تحفظ اور دنیا کے نظم و نسق کے لیے وضع کیا گیا ہے۔)

گویا فریضۂ 'امامت' حفاظتِ دین اور دینی سیاست کے لیے ہوتی ہے۔ اس بنا پر دین کی حفاظت کرنے والوں کے لیے سیاست ایک قوت کا کام کرتی ہے، جس کا کام اجتماعی نظام کا قیام ہے۔ دوسری جگہ ماوردی کہتے ہیں:

''منصب الخلافة فهو من حقوق السّیاسة.'' (4)

(خلافت کا منصب سیاست کے حقوق ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔)

علامہ راغب اصفہانی (م: ۵۰۲ھ/1108ء) کہتے ہیں:

"إنّ الخلافة تستحقّ بالسّياسة." (5)

(نیابتی حکومت کا استحقاق سیاست کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔)

امام غزالی (م: ۵۰۵ھ/1111ء) سیاست کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"استصلاح الخلق و إرشادهم إلىٰ الطّريق المستقيم المنجى فى الدُّنيا و الآخرة." (6)

(سیاست مخلوق کی اصلاح اور ایسے سیدھے راستے کی جانب رہنمائی کرنا ہے، جو دنیا اور آخرت کی نجات کا ذریعہ ہو۔)

امام غزالی مزید لکھتے ہیں:

"وهى التّاليف و الاجتماع و التّعاون علىٰ أسباب المعيشة و ضبطها." (7)

(سیاست کا مقصد وسائلِ معیشت کے حصول اور اس کا نظم و نسق قائم کرنے کے لیے لوگوں میں تعاونِ باہمی، اجتماعیت اور اُن میں اُنس و محبت پیدا کرنا ہے۔)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ/م: ۱۷۶۲ء) نے سیاست کی بہت واضح تعریف کی ہے:

"و هى الحكمة الباحثه من كيفية حفظ الرّبط الواقع بين أهل المدينة. و أعنى بالمدينة: جماعةً متقاربةً تجرى بينهم المعاملات، و يكونون أهل منازل شتّى." (8)

(ملکی سیاست ایک ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنا ہے، جس میں کسی ملک میں بسنے والے لوگوں کے درمیان ملکی سطح کے روابط (معاہدۂ عمرانی) کی حفاظت (اور اس میں تغیر و تبدل) کی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے۔ میری مراد ملک سے یہ ہے کہ اُس کے دائرۂ کار میں مختلف جماعتوں کے درمیان پیدا ہونے والے (سماجی، سیاسی اور معاشی حوالے سے) قریبی روابط اور دیگر معاملات طے ہوتے ہیں اور وہاں رہنے والے لوگ مختلف گھروں، محلوں اور شہروں میں بستے ہیں۔)

گویا وہ تمام معاملات و معاہدات جو افرادِ معاشرہ کے درمیان باہم اور حکومت کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان کی درست نوعیت کو متعین کرنا اور اس کے بارے میں رہنمائی دینا علم سیاست کا موضوع ہے۔ یہ تعریف نہایت جامع ہے جو سیاسی نظام کے تمام اداروں، انسانی سماج کے تمام شعبوں اور حکومت و عوام کے تعلقات اور زندگی کے تمام دائروں پر مشتمل ہے۔

سیاست کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ/م: 1831ء) لکھتے ہیں:

''سیاست دریں مقام عبارت ست از تربیت بندگان الٰہی بر قانون اصلاح معاش و معاد بطریق امامت و حکومت پس مقصود از سیاست اصلاح ایشاں ست بحکمرانی خود و نفع رسانی ایشاں در معاش و معاد نہ تحصیل منفعتے برای ذات خود باستخدام ایشاں۔''(9)

(اس مقام پر سیاست سے مراد یہ ہے کہ امامت اور حکومت کے ذریعے سے دُنیوی اور اُخروی اصلاح کے قانون کی بنیاد پر اللہ کے بندوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کام کرنا ہے۔ چناں چہ سیاست کا مقصد اپنی حکمرانی کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کرنا ہے اور انھیں دنیا اور آخرت میں نفع پہنچانا ہے۔ نہ کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو اپنا

خدمت گار بنا کر اپنی ذات کے لیے نفع اٹھانا ہے۔)

''امامت'' کا لغوی اور اصطلاحی معنی

دین اسلام میں سیاست کے لیے امامت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ امامت کے لغوی معنی رہنمائی اور رہبری کے ہیں۔ امامت اقتدا کی ضد ہے۔ اس کا اصطلاحی مفہوم بھی علما نے متعین کیا ہے۔ چناں چہ ماوردی کہتے ہیں:

''الإمامة موضوعة لخلافة النبوّة فی حراسة الدّین و سیاسة الدّنیا به.'' (10)

(امام کا لفظ نبی کی نیابت کے معنی کے لیے خاص ہے، جو دین کی حفاظت اور اُمور سیاست دین کے لیے ہے۔)

امام الحرمین الجوینی (م:۴۷۸ھ/1085ء) کے نزدیک:

''الإمامة ریاسة تامّة، وزعامة تتعلّق بالخاصّة والعامّة فی مهمّات الدّین و الدّنیا.'' (11)

(امامت ریاستِ تامہ اور ایسی رہنمائی کا نام ہے، جو دین اور دنیا کے عمومی وخصوصی اُمور سے متعلق ہو۔)

علامہ ابن خلدون (م:۸۰۸ھ/1405ء) کے نزدیک:

''إنّه نیابة عن صاحب الشّریعة فی حفظ الدّین و سیاسة الدّنیا به تسمّی خلافة و إمامة و القائم به خلیفة و إماماً.'' (12)

(''امامت'' دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست کے لیے صاحب شریعت کی جانشینی ہے۔ لہٰذا اس جانشینی اور نیابت کو خلافت اور امامت کہا جاتا ہے اور جو شخص اس کا انتظام کرتا ہے، اسے خلیفہ اور امام کہا جاتا ہے۔)

حاصل یہ کہ امام کے لغوی معنی پیشوا کے ہیں، جب کہ اصطلاحاً خلیفہ اور اُمور مسلمین کے متولی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اسلامی علوم میں کسی خاص علم، خصوصاً مذہبی علوم میں کسی ممتاز ومستند استاد یا مصنف کو بھی امام کہتے ہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ۔ امام بخاری۔ امام غزالی (۵۰۵ھ)۔ امام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ/1328ء) وغیرہم، پیش نماز کو بھی امام کہتے ہیں۔

ابن حزم امام کا معنی حاکم وقت کا کرتے ہیں لکھتے ہیں:

''وهٰکذا أخذت الإمامة معنی اصطلاحیا اسلامیا، فقصد بالإمام: خلیفة المسلمین و حاکمهم، وتوصف الإمامة احیاناً بالإمامة العظمی أوالکبریٰ تمیزاً لها عن الإمامة فی الصّلوٰة، علیٰ أنّ الإمامة إذا اطلقت فإنّها توجّه إلیٰ الإمامة الکبریٰ أو العامّة.'' (13)

(اسلامی اصطلاحات میں امام سے مراد خلیفۃ المسلمین اور مسلمانوں کا حاکم ہونا ہے۔ اور امامت کی صفت کبھی عظمیٰ یا کبریٰ استعمال کر کے امامت عظمیٰ یا امامت کبریٰ بولا جاتا ہے، ان صفات (عظمیٰ، کبریٰ) کے استعمال سے نماز کی امامت سے تمیز پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے۔ اور جب امام کا لفظ بغیر کسی قید یا صفت کے استعمال ہو تو امامت کبریٰ اور امامت عامہ مراد ہوتی ہے۔)

اس وضاحت کی روشنی میں امام کا عمومی اطلاق حاکم اور خلیفۃ المسلمین کے معنی میں ہوتا ہے۔

www.rahimia.org

خلافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی

خلافت خلف سے ہے، جس کا لغوی معنی پیچھے آنے والا وارث۔ پیچھے رہ جانے والے اور کسی کے جانشین ہونے کے ہیں۔ قرآن میں آتا ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ (14)

(جو کچھ ان کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔)

خلف کے معنی' متاخر اور جانشین ہونے کے بھی آتے ہیں۔ خلف کا لفظ جب لام کے جزم کے ساتھ ہو تو بمعنی بُرا جانشین اور جب لام کے فتح کے ساتھ ہو تو بہتر اور حق دار جانشین کے ہوتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

"و خلف فلان فلاناً إذا كان خليفته، يقال خلفه فى قومهٖ خلافة." (15)

قرآنی آیت ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ﴾ (16) (پھر ان کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے۔)

خلافۃ بمعنی جانشینی اور نیابت، خواہ اصل کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب ہو یا اس کے عجز کے سبب یا محض نائب کو شرف بخشنے کی غرض سے ہو'اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ نے اپنے اولیا کو زمین میں خلافت بخشی ہے۔قرآن میں ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ (17) (اور اس نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں۔)

اسلامی اصطلاح میں لفظ خلافت جانشینی اور مسلم حکمرانوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ابن خلدون کہتے ہیں:

"إنّه نيابة عن صاحب الشّريعة فى حفظ الدّين و سياسة الدّنيا به." (18)

(خلافت دین کی حفاظت اور دین کی سیاست کے لیے صاحب شریعت کی جانشینی ہے۔)

شاہ ولی اللہ خلافت کی دو اقسام' خلافت باطنہ اور خلافت ظاہرہ بیان کرتے ہیں۔ اور خلافت باطنہ کو امامت بمعنی تعلیم و تعلم اور دینی رہنمائی کے لیتے ہیں۔ جب کہ خلافت ظاہرہ سے حکمرانی مراد لیتے ہیں۔ (19)

چناں چہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ رقم طراز ہیں:

"هى الرّياسة العامّة فى التّصدّى لإقامة الدّين بإحياء العلوم الدّينية، و إقامة أركان الإسلام و القيام بالجهاد، و مايتعلّق بهٖ من ترتيب الجيوش، و الفرض للمقاتله، و اعطاء هم من الفىء، و القيام بالقضاء، و اقامة الحدود و رفع المظالم، و الأمر بالمعروف، و النّهى عن المنكر نيابة عن النّبىّ ﷺ." (20)

(خلافت اس عمومی سربراہی اور ریاست عامہ کا نام ہے، جو''اقامت دین'' کے کام کی تکمیل کے لیے وجود میں آئے۔ اس''اقامت دین'' کے دائرہ کار میں علوم دینیہ کا احیاء، ارکان اسلام کا قیام، جہاد اور اس کے متعلقات کا انتظام مثلاً لشکروں کی ترتیب، جنگوں میں حصہ لینے والوں کے حصص و مال غنیمت میں ان کا حق، نظام قضا کا اجرا، حدود قائم کرنا، مظالم اور شکایات کا ازالہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے اور یہ سب آں حضرت

www.rahnima.org

ﷺ کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیے۔)

قرآن میں ارشاد ہے:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ﴾ [21] (اے داوٗدؑ ہم نے آپ کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔)

اسی عدل پسند اور منصف مزاج انسان کو تاریخ اسلام میں ''خلیفہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

چناں چہ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:

"ومن كان أكثر حاله تلقى السّياسيات الكلّية ثمّ وفّق لإقامة العدل فى النّاس وذب الجور عنهم يسمّى خليفة." [22]

(وہ رہبر جسے اکثر وبیش تر سیاسیات کلیہ اور نظام کلی کی اصلاح کا القا کیا جاتا ہے۔ اور اسے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے اور ظلم وجور کو مٹانے کی توفیق عطا کی جاتی ہے، اسے ''خلیفہ'' کہتے ہیں۔)

حاصل یہ کہ خلافت جانشینی اور خلیفہ مسلم حکمران اور امیر المؤمنین کو کہتے ہیں، جس کی جمع خلفا ہے۔ [23]

خلافت کے ادوار

آں حضرت ﷺ کے بعد ملت اسلامیہ کی سربراہی کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ (م:۱۳ھ/634ء) منتخب ہوئے۔ جن کا لقب خلیفۃ الرسول تھا، کیوں کہ وہ رسول اللہ کے جانشین تھے۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ (م:۲۴ھ/642ء) نے یہ منصب سنبھالا تو ان کے لیے ''امیر المؤمنین'' کا لقب تجویز ہوا۔ پھر حضرت عثمان غنیؓ (م:۳۵ھ/ 656ء) اور حضرت علیؓ (م:۴۰ھ/660ء) یکے بعد دیگرے اس منصب کے لیے چنے گئے۔ پہلے چاروں بزرگ خلفا ''خلفائے راشدین'' کہلاتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور کو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''خلافت علیٰ منهاج النبوّة'' یا ''خلافتِ خاصه'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، یعنی یہ وہ دور ہے، جس میں نبی اکرمؐ کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل ان خلفائے راشدین نے کی تھی۔ [24] اس خلافت میں دینی اور دنیاوی دونوں زندگیوں کا عملی نقشہ بہترین صورت میں موجود تھا۔ مسلم جمہور کے ہاں جماعت صحابہؓ معیار حق وصداقت ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہاں خلافتِ عامہ کا دور خلفائے راشدین کے بعد شروع ہوا۔ اس دور کا آغاز خلافتِ بنواُمیہ سے ہوا۔ اس دور میں خلافت، بنواُمیہ میں منتقل ہوگئی اور دمشق اس کا مرکز قرار پایا۔ اس وقت سے لفظ خلافت حکومت کا ہم معنی بن گیا لیکن اس حکومت کا جسے دنیائے اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

بنواُمیہ کی خلافت 661ء-750ء تک رہی۔ پھر بنوعباس برسراقتدار آئے، جن کا مرکز خلافت بغداد تھا۔ یہ 750ء-1258ء تک حکمران رہے۔ بعد میں مصر کے مملوک سلطانوں نے عباسی خاندان کے ایک فرد کو قاہرہ میں خلیفہ مقرر کرلیا اور یہ سلسلہ 1517ء تک جاری رہا۔ لیکن ان خلفا کی حیثیت محض دینی وروحانی تھی۔ اُمورمملکت میں انہیں کوئی دخل نہ تھا۔ سلطان سلیم عثمانی نے مصر فتح کیا تو منصب خلافت خود سنبھالا۔ چناں چہ 1517ء-1924ء تک منصب خلافت، عثمانی سلاطین کے پاس رہا۔

www.rahimia.org

اُمویوں پر عباسیوں نے غلبہ حاصل کیا تو اُموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل اندلس (ہسپانیہ) پہنچ گیا اور اس نے وہاں مستقل حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔ اس خاندان کے آٹھویں اور سب سے بڑے حکمران عبدالرحمٰن الناصرلدین اللہ 912ء-961ء نے بھی خلافت کا دعوی کیا تھا مگر اس کا اقتدار صرف شمال مغربی افریقہ کے بعض حصوں تک محدود رہا۔

اس کے علاوہ دیگر مقامات اور زمانوں کی صورت حال بھی یہی رہی۔ چناں چہ مصر میں فاطمی بھی اپنی حکومت 906ء تا 1171ء کو خلافت کہتے تھے، لیکن ان کا دائرہ بھی بہت محدود رہا۔ عباسیوں کے دور میں نہایت عالی شان اور زبردست اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں۔ مثلاً ساسانیوں، غزنویوں، سلجوقیوں اور ہندوستان میں خاندان غلاماں اور تغلقوں، مصر اور شام میں زنگیوں اور ایوبیوں کی حکومتیں، مگر وہ اصولاً اپنے آپ کو مرکزی خلافت ہی کے تابع سمجھتی تھیں۔

امارت کا لُغوی اور اصطلاحی معنی

امارت کا لغوی معنی ہیں: تولیۃ الامارہ یعنی امیر و حاکم ہونا[25] امیر کی جمع امرا آتی ہے، بمعنی حاکم۔ حکم دینے والا[26] سپہ سالار۔ حاکم۔ فرماں روا[27] یہ اصطلاح بنیادی طور پر اسلامی ہے۔ اس سے اسلامی سلطنت کا سربرہ اور حکمران مراد ہوتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں امیر کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ گو کہ معنی میں قدرے تفاوت اور مراد مختلف ہے۔ حضرت علیؓ ایک حدیث روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

[قیل یا رسول اللّٰہ! من یؤمر بعدک؟ قال: ''أن تؤمرو ابابکر تجدوہ أمینا''.] [28]

(رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد کسے امیر بنایا جائے؟ تو آپ نے فرمایا! تم ابوبکرؓ کو امیر بنانا، تم اسے امین پاؤ گے۔)

قرآن میں یہ اصطلاح اولی الامر کی ترکیب کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔[29] اسلامی اصطلاحات بالخصوص وہ اُمور جو مملکت کے نظم و نسق سے متعلق ہیں، میں لفظ امیر کا استعمال مختلف مقاصد کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً ''امیر المومنین'' سربراہ مملکت ''امیرالبحر''، بحری فوجی بیڑے کا افسر ''امیرالامرا''، مغل حکومت میں معزز خطاب۔

تاریخ اسلام میں لفظ امیر کا استعمال

نبی ﷺ کے زمانے میں لفظ ''امیر'' کا استعمال متعدد اور مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اور یہ لفظ ''خلیفہ'' یا سربراہ مملکت کے لیے خاص نہ تھا۔ چناں چہ لفظ امیر، صوبوں، شہروں اور لشکروں کے اُمرا اور نگرانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ایک حدیث میں ذکر ہے:

[من أطاع أمیری فقد أطاعنی، و من عصا أمیر ی فقد عصانی.] [30]

(جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔)

خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں خلیفہ کے ساتھ ''امیر'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس اصطلاح کا

www.rahimia.org

استعمال حضرت عمرؓ کے زمانے میں شروع ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ وفات پا گئے تو حضرت عمرؓ کو شروع میں خلیفۃ الرسول ﷺ پکارا جانے لگا۔ جماعت صحابہؓ میں ایک موقع پر اس پر بحث ہوئی کہ حضرت عمرؓ کے بعد خلیفہ کے لیے ایک اور لفظ ''خلیفہ'' بڑھانا پڑے گا جو تین بار ہو جائے گا اور بعد والوں کے ساتھ مزید لفظ خلیفہ بڑھانے کی ضرورت ہو گی۔ یوں یہ عبارت طویل ہو جائے گی۔ تو طے ہوا کہ صرف ''خلیفہ'' کہا جائے۔ لیکن بعض صحابہؓ نے کہا کہ اس کی بجائے ''امیر'' کہا جائے' تو اس پر سب متفق ہو گئے۔ یوں تاریخ اسلام میں سربراہ مملکت کے طور پر سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو ''امیر'' پکارا گیا۔(31)

حضرت عمر فاروقؓ کے بعد بنو اُمیہ اور عباسی خلفائے بغداد ''امیر المؤمنین'' کہلائے۔ البتہ خلفائے بنو اُمیہ نے مالی اور انتظامی فرائض میں امتیاز کرنا شروع کیا (یعنی ہر دو کاموں کے لیے الگ الگ امیر مقرر کئے جاتے)۔ تاہم اس دور میں عموماً امیروں کو انتظامی اور مالی دونوں قسم کے مکمل اختیارات حاصل رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے اپنے صوبے میں ان کے اختیارات وہی ہیں جو پوری سلطنت میں خلیفہ کے ہیں۔ بہرحال بنو اُمیہ کے دور میں مختلف اُمور، افواج، مالیات، انتظامیہ خراج کی وصولی کرنے والوں کو امیر کہا جاتا تھا۔ عباسیوں نے انتظامی اُمور میں اُمویوں کا اتباع کیا۔ البتہ کچھ فرق کیا گیا، اور قبائلی امارات کی جگہ دفتری اقتدار کا نظام قائم کیا اور مرکزیت پر زور دیا۔ قاضی بھی امیر کے اقتدار سے آزاد ہو گیا کیوں کہ وہ براہ راست خلیفہ کی طرف سے مقرر ہوتا۔ اس طرح امیر کے انتظامی اختیارات کم ہو گئے۔

بنوعباس کے دورِ اول کے خاتمے سے پہلے صورت حال یکسر بدلی اور اہم تغیر یہ ہوا کہ امیر کا تقرر' ہوتا تو خلیفہ کی طرف سے تھا لیکن خراج کی مقررہ مقدار ادا کرنے کے بعد وہ اختیار کلی کا مالک ہو جاتا اور اکثر اُمور میں دربار خلافت سے ہدایات لینے کا پابند نہ ہوتا تھا۔ آخر میں عثمانی ترک سلاطین' متعدد اسلامی ملکوں میں خلیفہ اسلام مانے جاتے اور ''امیر المؤمنین'' کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ برعظیم ہند میں انگریز کی آمد کے وقت افغانستان کے حکمران بھی امیر کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ قرون وسطی میں یورپی اور چینی زبانوں میں یہ لقب کئی مسخ شدہ صورتوں میں بولا جاتا تھا۔(32)

امام، خلیفہ اور امیر المومنین کی اصطلاحات کا موازنہ

رسول اکرم ﷺ صحابہؓ کرام اور تابعین سے منقول روایات کے احاطہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے دورِ اول میں امام، خلیفہ اور امیر کے الفاظ مترادف معانی کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ مفردات القرآن میں ہے:

''خلیفہ پیچھے آنے والے وارث، جانشین، مسلمانوں کے بادشاہ اور امیر المومنین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔''(33)

چناں چہ حضور ﷺ، صحابہ کرامؓ اور تابعین نے امام اور خلیفہ کے استعمال میں فرق نہیں کیا بلکہ دونوں کو مترادف معنی کے طور پر لیا۔ البتہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں نے ان دو الفاظ کے ساتھ امیر کے لفظ کا استعمال شروع کیا۔ اُمت میں ان تینوں الفاظ کے ایک ہی معنی کے لیے استعمال کیا اور علما کے رجحانات سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تینوں الفاظ مترادف ہیں' جو ایک ہی معنی دیتے ہیں۔ علامہ نووی (م:٦٧٦ھ/1278ء) فرماتے ہیں:

"یجوز أن یقال للإمام: الخلیفة، والإمام، و أمیر المؤمنین."(34)

(امام کو خلیفہ، امام اور امیر المؤمنین کہنا جائز ہے۔)

ابن خلدون یہی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"إنّه نيابة عن صاحب الشّريعة فی حفظ الدّين و سياسة الدّنيا به تسمّی خلافة و إمامة و القائم به خليفة و إماماً." (35)

(''خلافت'' دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست کے لیے صاحب شریعت کی جانشینی ہے۔ لہٰذا اس جانشینی اور نیابت کو خلافت اور امامت کہا جاتا ہے اور جو شخص اس کا انتظام کرتا ہے اسے خلیفہ اور امام کہا جاتا ہے۔)

ابن خلدون مزید کہتے ہیں کہ:

"فإمّا تسميته إماماً فتشبيهاً بإمام الصّلوٰة فی اتّباعه و الاقتداء به، و لهٰذا يقال الإمامة الكبریٰ و أمّا تسميته خليفة فلكونه يخلف النّبیّ فی اُمّته فيقال خليفة بإطلاق و خليفة رسول اللّٰه." (36)

(البتہ خلیفہ کو امام اس لیے کہتے ہیں کہ عملاً یہ امامِ نماز کے مشابہ ہے۔ کہ جیسے مقتدی کو اپنے امام کی پیروی لازم ہے۔ اسی طرح تمام رعایا کو اپنے خلیفہ کی پیروی لازم ہے۔ اس لیے خلافت کو امامت کبریٰ بھی کہا جاتا ہے اور خلیفہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اُمت میں پیغمبر کی جانشینی کے فرائض انجام دیتا ہے۔)

شیخ ابوزھرہ (م:۱۹۷۴ء) تینوں الفاظ کا مترادف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"المذاهب السّياسة كلّها تدور حول الخلافة و هی الإمامة الكبریٰ وسمّيت خلافة لأن الّذی يتولّاها، و يكون الحاكم الأعظم للمسلمين يخلف النّبیّ ﷺ فی إدارة شئونهم، وتسمّی إمامة: لأنّ الخليفة كان يسمّی إماماً، و لأنّ طاعته واجبة، و لأنّ النّاس كانوا يسيرون وراءه كما يصلّون وراء من يؤمهم الصّلاة." (37)

(تمام مذاہب کی سیاست، خلافت اور امامت کبری کے گرد گھومتی ہے اور اس ادارے کا نام ''خلافت'' ہے۔ اس لیے کہ اس ادارے کا جو سربراہ ہوتا ہے، وہ حضور کی نیابت (خلافت) میں مسلمانوں کا امام اعظم ہوتا ہے اور اس کا نام ''امام'' رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ خلیفہ امام ہوتا ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے۔)

سلطنت کا لُغوی اور اصطلاحی مفہوم

سلطنت کا لفظ دلیل، اقتدار، قدرت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے اس کا مادہ س۔ ل۔ ط ''السلاط'' ہے۔ اس کے معنی غلبہ حاصل کرنے کے ہیں۔ سلطہ فتسلط کے معنی ہیں، میں نے اسے مقہور کیا، تو وہ مقہور ہوگیا۔ (38) یہ استعمال فارسیوں نے کیا ہے۔ انھی کے ہاں سلطنت بمعنی بادشاہت وحکومت کے ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ﴾ (39) (اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا۔)

اسی سے لفظ سلطان ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے ہاں قرآن مجید میں ہر جگہ سلطان بمعنی حجت اور دلیل ہے۔ (40)

قرآن میں ہے:

﴿وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا﴾ (41) (اور عطا کردے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد۔)

یہاں سلطان بمعنی حکمران ہے یعنی بادشاہ، فرماں روا۔ گویا سلطان بمعنی بادشاہ کی طاقت نیز اس شخص کی طاقت کے ہیں، جو گو بادشاہ نہ ہو مگر اس کو شاہی طاقت حاصل ہو۔ جیسے کہتے ہیں:

''قد جعلت لک سلطاناً علٰی أخذ حقی من فلان.'' (42)

(فلاں سے میرا حق لینے کے لیے میں نے تیرے لیے سند کر دی ہے۔)

حدیث مبارکہ میں ہے: [من أهان سلطان اللّٰه فی الأرض أهانهٔ اللّٰه] (43)

(جس نے زمین پر سلطان (عادل) کی اعانت کی، اس نے اللہ کی اعانت کی۔)

غالبًا یہ لفظ اس وقت استعمال ہوا جب خلافت عباسیہ کے دور میں خود مختار علاقے وجود میں آ گئے۔ جو خلافت کا احترام کرتے ہوئے اس اصطلاح کی جگہ اس کی نیابت میں یہ لفظ استعمال کرنے لگے اور بغداد سے اپنی مسند حکومت حاصل کرتے مگر اپنے معاملات میں خود مختار ہوتے جیسے سلطان محمود غزنوی وغیرہ۔

مملکت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

مملکت کا لفظ سلطنت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ (44) ملوکیت بمعنی بادشاہی نظام حکومت۔ (45) ملک سے مراد وہ بادشاہ ہے جو پبلک پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف انسانوں کے منتظم کے ساتھ خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک الناس تو کہا جاتا ہے لیکن ملک الاشیا کہنا صحیح نہیں ہے۔ اور آیت:

﴿مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ﴾ (46) (انصاف کے دن کا حاکم)

میں ملک (ایک روایت میں) کی اضافت یوم کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ اصل ملک الملک فی الدین ہے۔ یعنی قیامت کے دن اسی کی بادشاہت ہو گی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ﴾ (47) (آج کس کی بادشاہت ہے۔)

قرآن میں لفظ ملک کئی جگہ دنیاوی بادشاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چناں چہ:

﴿وَقَالَ الۡمَلِكُ اِنِّىۡۤ اَرٰى سَبۡعَ بَقَرٰتٍ﴾ (48) (اور کہا بادشاہ نے کہ میں دیکھتا ہوں سات گائیں۔)

میں مصر کا بادشاہ مراد ہے جو حضرت یوسفؑ کے زمانے میں تھا اور:

﴿وَكَانَ وَرَآءَهُمۡ مَّلِكٌ﴾ (49) (اور ان کے ورے ایک بادشاہ تھا۔)

میں، کوئی حکمران یا بادشاہ مراد ہے۔ جس کے ظلم سے محفوظ رکھنے کے لیے حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا تختہ توڑ دیا تھا۔

قرآن میں متعدد مقامات پر ملک بمعنی بادشاہ حقیقی یعنی اللہ مراد ہیں جیسے:

﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ (50) (لوگوں کا بادشاہ)

میں اللہ مراد ہیں۔

www.rahimia.org

وزارت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

وزارت وِزر سے ہے، اور وِزر کا معنی بارگراں ہے، وزیر سے مراد وہ فرد ہے، جو امیر کا بوجھ اور اس کی ذمے داریاں اٹھائے ہوئے ہو۔(51) اس کے اس عہدے کو وزارت کہا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ وزیر کی تعریف اور فرائض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الوزیر، و هو مرجع العُمّال، و هو العارف بجبایة الأموال و تفریقها، و المسئول عنه فی ذٰلک.'' (52)

(جو تمام ماتحت حاکموں کے لیے ذمے دار ہؤا سے لوگوں سے اموال جمع کرنے اور ان کو مناسب طور پر شعبوں میں تقسیم و خرچ کرنے میں ماہر ہونا چاہیے۔ اور نظام ملک میں اقتصادیات آمد و خرچ وغیرہ کی ذمے داری اسی پر عائد ہوگی۔)

سیاست اور حکومت کی جدید اصطلاحات

جن ملکوں میں صدارتی نظام ہے، وہاں کا صدارت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال میر مجلس، ملک کا سربراہ، سامنے کا رخ، صدر جمہوریہ کسی جمہوری حکومت کا سربراہ، صدر مملکت کسی ریاست یا حکومت کا سربراہ۔(53)

صدر کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

لغوی معنی: ہر چیز کا سامنے سے اوپر کا حصہ، سینہ، صدر القوم، قوم کا رئیس۔ جمع: صدور۔(54)

المورد قاموس انگلیزی کے مطابق صدر کا معنی، سردار، قائد، رئیس جمہوریہ اور President ہے۔(55)

پاکستان کا صدر وفاق کا سربراہ ہوتا ہے۔ پارلیمانی نظام میں عام طور پر یہ غیر انتظامی عہدہ ہوتا ہے۔ وزیر اعظم کی نصیحت پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

ریاست کا لغوی اور اصطلاحی معنی

لغوی اعتبار سے ریاست عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں ''ریاسۃ'' کا مادہ ''رأس'' سے ہے۔ اور اسی سے ''الرائیس'' ہے۔ ''رائیس'' یا ''رائس'' بلند مرتبہ یا اول المقام شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔(56)

ماہرین سیاسیات نے ریاست کے اصطلاحی معنی کے بیان میں سیاسی اور معاشرتی دونوں نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھا ہے کیوں کہ ریاست، سیاست اور معاشرت دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ایک کہاوت مشہور ہے۔ ریاست بے سیاست نہیں ہوسکتی اور حکومت کے لیے انتظام کی لیاقت چاہیے۔(57)

اس بنا پر ماہرین معاشرت ریاست کا یہ معنی بیان کرتے ہیں:

''ریاست انسانوں کا ایک گروہ یا تنظیم ہے جو مشترکہ مقاصد کے لیے مل جل کر کام کرے۔(58)

اس لحاظ سے ''ریاست'' سیاسی طور پر ایک منظّم ملت جو کم و بیش آزاد ہوتی ہے اور اس کے قبضہ و تصرف میں ایک مستقل اور

www.rahimia.org

معین علاقہ ہوتا ہے۔

مشہور مسلم مفکر ابوالنصر فارابی (872ء۔950ء) ریاست کی اصطلاحی تعریف اس کی دو اقسام ۱۔ ریاستِ فاضلہ، ۲۔ ریاستِ جاہلیہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریاست تمكن الأفعال، و السّنن، والملكات الإرادية الّتی شأنها أن ينال بها ما هو فی الحقيقة سعادة، و هی "الرّياسة الفاضلة"، و المدن و الأمم المنقادة لهٰذهٖ الرّياسة هی المدن و الأمم الفاضلة. و الرّياسة تمكّن فی المدن الأفعال و الشيم الّتی ينال بها ما هی مظنونة أنّها سعادات من غير أن تكون كذٰلك وهی "رياسة الجاهلية." (59)

(ایک وہ ریاست ہے جو ان عادات و افعال اور اخلاق و اقدار کو فروغ دیتی ہے جن کے ذریعے حقیقی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ ریاستِ فاضلہ کہلاتی ہے۔ یعنی بہترین حکومت، اور وہ اقوام و معاشرے جو اس ریاست کے تابع اور وفادار ہوں وہ بہترین معاشرے اور قومیں ہوتی ہیں۔ اور دوسری ریاست وہ ہے جو معاشرے میں ان عادات و افعال کو رواج دیتی ہے۔ جو بہ ظاہر خیالی اور وہمی مسرت کا ذریعہ تو ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہوتیں یہ ''ریاست جاہلیہ'' ہوتی ہیں۔)

فارابی کی رائے کے مطابق ''ریاست'' کے لیے روحانیت اور عمدہ اخلاق کی ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک وہ ریاست اچھی اور فاضلہ کہلائے گی جو اپنے باشندوں کی اخلاقی تربیت کرے اور عوام ریاست کے فرماں بردار ہوں۔

امام شاہ ولی اللہ ''ریاست'' کی تعریف اہل مدینہ اور سیاست مدینہ کے الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اپنی مثالی اور معروف کتاب ''حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ'' میں شاہ ولی اللہ رقمطراز ہیں:

وهی الحكمة الباحثه عن كيفية حفظ الربط الواقع بين أهل المدينة، واعنى بالمدنية؛ جماعة متقاربة تجری بينهم المعاملات، ويكونون اهل منازل شتى. (60)

(اہل مدینہ سے مراد لوگوں کی وہ جماعت ہے جو ایک ہی نظام تمدن کے تابع اور پابندیوں میں باہم مل جل کر اجتماعی زندگی بسر کریں۔ اس جماعت کو اگرچہ وہ مختلف شہروں میں رہتے ہوں، ایک اجتماعیت سمجھا جاتا ہے۔)

شاہ ولی اللہ کی دیگر تصریحات کی روشنی میں ''ریاست'' تمام شہریوں کے تحفظ اور بہتری کی ذمہ داری لیتی ہے۔ ایک فلاحی ریاست اپنے شہریوں کے جانی، مالی اور تمام سماجی حقوق کا تحفظ، لسانی، مذہبی اور علاقائی امتیاز سے بالاتر ہو کر کرتی ہے۔ (61)

اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیات

اسلامی ریاست کا تصور قرآن و سنت کی روشنی میں ان بنیادی اصولوں پر قائم ہے جو حضور ﷺ کی سربراہی میں ریاستِ مدینہ کی صورت میں قائم ہوئی۔ ریاست مدینہ کی تشکیل درج ذیل اصولوں پر کی گئی۔

www.rahimia.org

۱۔ حاکمیت الٰہی کا تصور

اسلامی ریاست کا اصل منبع اور اقتدار اعلیٰ اللہ کے ساتھ خاص ہے، جس کا معنی ہے حاکم ریاست اس نظام حیات کا پابند ہے جو قرآن وسنت نے واضح کر دیے ہیں۔ اور یہ نیابت الٰہی میں ان اصولوں کو عملی شکل دے گا۔ وہ آمرِ مطلق اور ذاتی رجحانات کو مسلط کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہوگا۔ گویا مقتدر حقیقی ذاتِ الٰہی ہے۔ انسان اس کا نائب اور نمائندہ ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ (62) (سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا)

جب کائنات کی ہر چیز اس کی مخلوق ہے تو قانون دینے کا اختیار بھی اسی کا ہے۔ اس کو عصر حاضر میں (Sovereignty) اقتدارِ اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ امام ابوالحسن الماوردی اپنی تصنیف ''الاحکام السلطانیہ'' کا آغاز ہی اللہ کے حاکم مطلق ہونے کے تذکرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ (63)

۲۔ متعین، دوٹوک نظریے کی پابند ریاست

اسلامی ریاست واضح اور دوٹوک نظریات کی پابند ریاست ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰہُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ (64)

(وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام۔)

اس کی عملی صورت قرآن نے دعوت انبیا کے مشترکہ پروگرام کی صورت میں یوں بیان فرمائی:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَہُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (65)

(ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر۔)

ان آیات سے یہ بات واضح ہے کہ اسلامی ریاست ایک متعین پروگرام اختیار کرنے کی ذمے دار ہے، جس کی عملی تشکیل عدل وانصاف کا قیام اور مثالی معاشرہ قائم کرنا ہے۔ جو حاکمیت الٰہی کے قیام کے ذریعے حقوق انسانی کو بلاتفریق رنگ، نسل اور مذہب کے قائم کرتی ہے۔ اس میں خود حاکم کو بھی عدل وانصاف کے کڑے معیار پر اُترنا ہوگا۔ چناں چہ آں حضرتؐ کا ارشاد ہے:

''و الّذی نفس محمّد بیدہٖ لو سرقت فاطمه بنت محمّد لقطعت یدھا.'' (66)

(قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر محمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔)

www.rahimia.org

۳۔ منصبِ حکومت، اہلیت اور امانت کے تصور سے

اسلامی ریاست کی ذمے داریاں اقربا پروری کے گھناؤنے کھیل کے بہ جائے اہلیت اور ادائیگی ذمے داری کے اصول پر دی جاتی ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (67)

(بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے۔)

آپ ﷺ نے اس کی عملی مثالیں قائم کیں اور کسی ایسے شخص کو ذمے داری نہیں دی جو اہلیت کا حامل نہ ہو۔ حکومتی عہدوں پر اہل، ذمے دار لوگ تعینات کیے۔ اس کا جائزہ حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے زاہد حقیقی اور اسلامی تعلیمات کے عملی مظہر کی اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ جب انھوں نے خود بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کیا:

"ألا تستعملني؟ قال: فضرب بيده علٰى منكبي، ثمّ قال: "يا اباذر! إنّک ضعيف، و إنّها أمانة، و إنّها يوم القيامة خزى وندامة إلّا من أخذها بحقّها وادى الّذى عليه فيها." (68)

(یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ مجھے عامل نہیں بنائیں گے؟ اس پر حضور ﷺ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا: ''اے ابوذر! تم کمزور ہو اور یہ امارت امانت ہے اور یہ قیامت کے دن رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہوگی۔ البتہ (وہ مستثنٰی ہوگا) جو امارت کے حقوق ادا کرے اور اس کی ذمے داریاں پوری کرے۔)

اس روایت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی ریاست میں اہلیت معیار ہے، محض زہد و ورع منصب کے حصول میں مددگار نہیں ہو سکتا۔

آپ ﷺ نے کبھی کسی ایسے شخص کو حکومتی منصب نہیں دیا جو اس کی طلب رکھتا ہو۔ آپ ﷺ نے اصولی بات فرمائی:

"أنا و اللّٰه لا نولي علٰى هٰذا العمل أحداً أسأله و لا أحداً حرص عليه." (69)

(خدا کی قسم ہم کسی شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے جو اس کا حریص ہو۔)

۴۔ فلاحی مملکت

اسلامی ریاست انسان دوست اور حقیقی فلاحی ریاست ہوتی ہے۔ جس میں جمہور کے معاشی حقوق کا تحفظ ناگزیر ہے یہ ریاست سرمایہ شکن ہے اس ریاست میں سرمایہ پرستی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"تؤخذ من أغنياء هم فتردّ علٰى فقراء هم." (70)

(ان کے مال داروں سے (دولت) لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔)

اور یہ غربا پر کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ دین اسلام نے اسے مالی طور پر کمزور لوگوں کا ''حق'' قرار دیا۔ اس لیے قرآن نے یہ ضابطہ بیان کیا:

www.rahnima.org

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ (71)

(ان کے مالوں میں حق ہے، سوال کرنے والوں اور محروم لوگوں کا)

اس ضمن میں علمائے اُمت کے کئی اقوال بھی ملتے ہیں۔ ان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

(حکومت ہر فرد کی زندگی میں اس کی کفالت کی ذمے دار ہوگی۔ جب کہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔)(72)

یہ اس صورت میں ممکن ہوگا جب بہترین اقتصادی نظام قائم کیا جائے کہ خود کار نظام کے تحت ہر فرد کی بنیادی ضروریات احتیاجات بہ حسن و خوبی، آزادی اور عزت نفس کے ساتھ پوری ہوں۔ نہ کہ کوئی سرمایہ دار یا حکمران وقت پہلے لوگوں کو محتاج اور بے دست و پا کرے پھر ضروریات مہیا کرنے کے لیے غربا کی لائنیں لگوا کر خیرات بانٹے۔ انھیں مزید ذلیل و رسوا کرے اور خود حاکمِ وقت حاتم طائی قرار پائے۔

علامہ ابن حزمؒ کہتے ہیں:

''امیر کی ذمے داری ہے کہ وہ لوگوں کے لیے ان کی ضروری حاجات کی فراہمی کا اہتمام کرے۔ انھیں روٹی مہیا ہو، پہننے کے لیے (گرمی و سردی کی ضرورت کے تحت) لباس فراہم کیا جائے اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان جو ان کو بارش، گرمی و سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے۔''(73)

ان معیارات پر عہدِ نبویؐ، دورِ خلفا اور گیارہ سو سال تک مسلمان عادلانہ ریاست قائم کیے رہے۔ اب تین سو سال سے دنیا اس نعمت سے محروم ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ اپنا فریضہ ادا کریں۔

دستور پاکستان میں پریزیڈنٹ (صدر) کی یہ تعریف کی گئی ہے:

"There shall be a President of Pakistan who shall be the Head of State and shall represent the unity of the republic" (74)

پاکستانی دستور کے مطابق صدر، ریاست کا محافظ اور نگران ہوتا ہے البتہ جن ممالک میں صدارتی نظام بطور سیاسی حکومت کے ہے، وہاں صدر کو تمام ریاستی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جیسے متحدہ امریکا کا صدر۔ مگر پاکستان میں انتظامی اختیارات وزیراعظم کے پاس ہوتے ہیں۔

یورپین مفکرین ریاست کی تعریف یہ کرتے ہیں:

"The State is only there to give individuals their fullest opportunity of living a good life, they not the state, being the judge of what goodness, is for them, and finally, the authority cannot come from above or from outside, its only source is the people themselves."(75)

(ریاست دراصل افراد معاشرہ کو ایک اچھی زندگی گزارنے کے مکمل مواقع فراہم کرنے کے لیے ہوتی ہے اور یہ کہ اپنے لیے ''اچھائی'' کا فیصلہ کرنے کا اختیار خود افراد کو حاصل ہوتا ہے، ریاست کو نہیں۔ اور اس سلسلہ میں آخری

www.rahima.org

نقطہ یہ ہے کہ اختیار حاکمیت کا بنیادی سرچشمہ لوگ خود ہوتے ہیں۔ یہ کہیں عالم بالا یا عالم خارجی سے وارد نہیں ہو سکتا۔)

اس لحاظ سے اسٹیٹ عوامی امنگوں کی ترجمان ہوتی ہے۔ دستورِ پاکستان میں میں اسٹیٹ کی یہ تعریف ذکر کی گئی ہے:

"In this part , unless the context otherwise requires, "The State" means the Federal Government, [Majlis-e-Shoora(Parliament)], a Provincial Government, a Provincial Assembly, and such local or other authorities in Pakistan as are by law empowered to impose any tax or cess." (76)

(اس لحاظ سے سٹیٹ کا مطلب ہے' فیڈرل حکومت، ایک صوبائی حکومت، صوبائی اسمبلی اور پاکستان میں ایسے مقامی یا دوسرے بااختیار ادارے جو ٹیکس لاگو کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔)

اس بنا پر ریاست قومی، صوبائی اور لوکل بااختیار اداروں کو کہتے ہیں۔ جو دستور کی روشنی میں عوامی مفاد کے فیصلے کرنے اور انہیں نافذ کرنے کا اختیار رکھتے ہوں۔

حکومت کا لُغوی اور اصطلاحی معنی

یہ لفظ عصر حاضر میں گورنمنٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

حکومت ایسی ہیئت حاکمہ کو کہتے ہیں' جس کی تنظیم انسانی افراد کی اجتماعی تصویر اور تدبیر سے ہوتی ہے یعنی جہاں بانی اور جہاں داری کا وہ عزم جو زمین کے کسی مخصوص حصہ میں ایک ہیئت حاکمہ اختیار کر لیتا ہے اور اس ہیئت میں اس کا اختیار و اقتدار پورا پورا کام کرتا ہے۔ (77)

سیاسی اصطلاحات کے حوالے سے خلاصۂ کلام

امام، امیر، خلیفہ کی اصطلاحات کا مفہوم، اسلامی علوم میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قریب قریب ہے جو خدمت خلق اور قانونِ الٰہی کے نفاذ کی بھاری ذمے داری کا نام ہے اور یہی مفہوم سیاست کا ہے۔

جب کہ سلطان اور مَلِک کا معنی عام طور پر حکومتی ذمے داری کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں فرد کو کافی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ گویا سیاست، خلافت و امامت، خدمت، ایثار، ہمدردی اور رضائے الٰہی کے حصول کے ذریعے کا نام ہے البتہ صدارت اور وزارت عظمیٰ، یہ جدید نظاموں کی اصطلاحات ہیں۔ جن کو چند اصلاحات اور تغیر و تبدل کے بعد، امامت و خلافت کے قریب لایا جا سکتا ہے لیکن ریاست، ریاستی اداروں اور ان کے ذمے داران کو للّٰہیت، انسان دوستی اور خدمت خلق کا جو صواب راستہ دینی تصورات میں ملتا ہے' وہ جدید تصورات میں نہیں۔ دینی تصورات پر مبنی ریاستی ادوار میں انبیائے کرام علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کے ادوار کی روشنی میں عدل و انصاف، اَمن و آشتی اور خوش حالی' جو خدمت انسانی کے جذبہ

سے ہو' کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ جدید ریاستی تصورات میں بلند بانگ دعوے تو بہت ہیں مگر ابھی حقیقت بہت دور ہے۔

سیاسی نظام کے قیام کی شرعی حیثیت

معاشرے کو عدل و انصاف اور اجتماعیت پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مشترکہ جدوجہد کے ذریعے خیر کے فروغ اور انسدادِ ظلم کے لیے کوشاں رہا جائے۔ اس ذمے داری کو انبیا علیہم السلام بخوبی نبھاتے رہے۔ اس اَمر کو قرآن، حدیث اور علمائے اُمت کی تصریحات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (78)

(ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر۔)

یہ آیت مبارکہ انبیائے کرام کا مشترکہ مشن بیان کر رہی ہے کہ وہ عدل وانصاف کے قیام کے لیے مصروفِ عمل رہے۔ یعنی انصاف اور اجتماعیت کو قائم کرنے کے لیے اُمم سابقہ سے اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کے قیام کا تقاضا کیا جاتا رہا۔ جب کہ ایک جگہ ہے:

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ﴾ (79)

(سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے کہ جن کو ہم نے بچا لیا ان میں سے اور پیچھے پڑے ظالم اسی چیز کے جس میں ان کو عیش ملا اور وہ تھے گنہگار۔)

اور حضرت لقمانؑ کے واقعہ میں مذکور ہے:

﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (80)

(اے میرے فرزند! نماز قائم رکھ اور اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کر اور تجھ پر جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ بے شک یہ ہیں ہمت کے کام۔)

یعنی اُمم سابقہ سے اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کے قیام کا تقاضا بدستور رہا جنہیں قرآن نے نمائندہ واقعات میں ذکر کیا ہے۔ قرآنی ہدایات کی روشنی میں ہر مسلمان کا فرض ہے' کہ وہ حق بات کہے اور باطل کے خلاف جدوجہد کرے اور عدل وانصاف کے قیام کے لیے اپنی بساط کے مطابق کوشش کرے۔ برائی کی مدد کرنا یا برائی کو دیکھ کر خاموش ہو جانا اور اس کے خاتمہ کی کوشش نہ کرنا' قرآن کی نگاہ میں ناقابل معافی جرم ہے۔ چناں چہ بنی اسرائیل پر مختلف مواقع پر عذابِ الٰہی اور اللہ کی رحمت سے دُوری کا سبب یہ بنا کہ وہ ظلم و ناانصافی اور سماجی برائیوں (Social evills) پر خاموش تماشائی بنے رہتے، بالواسطہ یا بلاواسطہ اس برائی کو قائم رکھنے کا سبب بنتے۔ چناں چہ قرآن میں ذکر ہے:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا

لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (81)

(بنی اسرائیل میں سے جو کافر ہوئے ان پر داؤد اور عیسی ابن مریم علیہا السلام کی زبان پر لعنت کی گئی یہ اس لیے کہ وہ نافرمان تھے، اور حد سے گزر گئے تھے۔ آپس میں منع نہ کرتے تھے، برے کام سے جو وہ کر رہے تھے۔)

اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم ہر شریعت کی طرح اسلامی شریعت میں بھی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہوا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (82)

(اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی لوگ ہیں جو پہنچے اپنی مراد کو۔)

سورۃ العلق میں تو قرآن نے سیاسی جدوجہد کے ذریعے قیام عدل کرنے والوں کو اپنی جماعت قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۙ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ﴾ (83)

اب بلالیوے (طاغی) اپنی مجلس والوں کو ہم بھی بلاتے ہیں، پیادے سیاست کرنے کو۔)

سورۃ العلق کی اس آیت کا سیاق و سباق معاشرتی انصاف کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت اور اس کے مخالف گروہ کے تذکرہ پر مبنی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ''الزّبانیہ'' کا ترجمہ ''پیادے سیاست کرنے کو'' کر کے اس مفہوم کی نشان دہی کی ہے۔

اطاعتِ الٰہی و رسول اللہؐ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے تقاضے سے روگردانی کی صورت میں مسلمانوں کو قرآن' عمومی عذاب سے ڈراتا ہے۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ (84)

(اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں پر ہی اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔)

ان مذکورہ آیات کے علاوہ قرآن کی متعدد آیات ہیں جو مسلمانوں کو معاشرتی اصلاح اور بہتر تبدیلی کی خاطر ذمے دارانہ اجتماعی کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں اور دینی سیاسی کردار کی ادائیگی کا حکم دیتی ہیں۔ اس بنا پر دینی سیاسی کردار معروف معنوں میں سیاست گردی نہیں بلکہ حقوق العباد کے قیام کے لیے مبارک اور مقدس جدوجہد کا نام ہے۔

سماجی تبدیلی کے لیے جدوجہد اور سیاسی کردار کے لیے احادیث مبارکہ سے بھی ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

[و الّذی نفسی بیدہٖ لتأمرنّ بالمعروف، و تنھون عن المنکر، أو لیوشکنّ اللّٰہ أن یبعث علیکم عذاباً من عندہٖ، ثم تدعنہ فلا یستجاب لکم.] (85)

(اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تمھارا فرض ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے منع کرو، ورنہ خدا یقیناً تم پر اپنی طرف سے ایک عذاب مسلط کر دے گا پھر تم اللہ کو پکارو گے مگر وہ تمھیں جواب نہ دے گا۔)

www.rahimia.org

اجتماعی گناہوں کے نتیجے میں خدا کی ناراضگی اور عذاب کی یہ نوعیت عمومی ہوتی ہے۔ صرف گناہ گاروں تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ان لوگوں کو بھی عذاب کی کسک پہنچتی ہے جو گناہوں میں تو ملوث نہیں ہوتے لیکن گناہ گاروں کو روکتے بھی نہیں۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

[إنّ النّاس إذا رأوا الظّالم فلم يأخذوا علىٰ يديهٖ أوشک أن يعمّهم اللّٰه بعقابهٖ.] (86)

(اگر لوگ کسی کو ظلم کرتا ہوا دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ روکیں تو اغلب ہے، خدا ان سب کو اپنے عذاب کے گھیرے میں لے لے۔)

اسی مضمون کی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ایک اور روایت ہے:

[ما من قوم يعمل فيهم بالمعاصى، ثمّ يقدرون علىٰ أن يغيروا، ثمّ لا يغيرون أن لا يوشک أن يعمّهم اللّٰه منه بعقاب.] (87)

(جب ایک قوم کے درمیان گناہوں کا ارتکاب جاری ہو۔ جنہیں درست کرنے پر وہ قادر ہو مگر وہ اس حالت کو درست نہیں کرتی۔ اغلب ہے خدا کا عذاب اسے کاملاً اپنے گھیرے میں لے لے۔)

سماجی زندگی کی تبدیلی، جدوجہد سے اعراض، ظالم کو ظلم سے روکنے اور کمزوروں کے حقوق قائم کرنے کی ذمے داری سے پہلوتہی کا نتیجہ سماجی تقسیم اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں نکلتا ہے۔ چناں چہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

[كلّا و اللّٰه لتأمرنّ بالمعروف، و لتنهون عن المنكر، و لتأخذن علىٰ يدى الظّالم، و لتأطرنّه علىٰ الحقّ اطرأ، و لتقصرنّه علىٰ الحقّ قصراً، و ليضربنّ اللّٰه قلوب بعضكم علىٰ بعض.] (88)

(نہیں خدا کی قسم! تمھیں ضرور نیکی کا حکم دینا چاہیے، بدی سے روکنا چاہیے اور طاقت سے ظالم کو ظلم سے روکنا چاہیے اور اسے مجبور کر کے حق کا پابند بنانا چاہیے ورنہ خدا تم میں سے بعض کے قلوب بعض کے مخالف بنا دے گا۔)

یہ تمام آیات و احادیث مسلمانوں کو اس بات کا پابند کرتی ہیں کہ وہ مجرمانہ سوچ رکھنے والوں کی اصلاح، انہیں سماج دشمن رویوں سے روکنے اور قومی حالات کے سدھارنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔ اس اُمت کی حقیقی خوبی اس کا یہی عمل ہے۔ چناں چہ حضرت عمرؓ قرآن کی آیت مبارکہ:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (89)

(تم سب اُمتوں میں سے بہتر ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے بھیجی گئی ہو۔)

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کہ اس اُمت کا خیر اُمت ہونا مشروط ہے ''اُخرجت للنّاس'' کے ساتھ۔ یعنی اس اُمت کی بہتری اور خیر اُمت ہونے کا سبب ان کا انسانیت کے لیے مفید ہونا ہے۔

اس بنا پر مسلم جماعت کے ہر فرد کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اجتماعی ترقی اور انسانی حقوق کے قیام کے لیے شعور بیدار کرتا رہے تاکہ ظلم وستم کے شکار لوگ حقیقی ذمے داروں سے آگاہ اور اپنے مسائل کے حل کا شعور حاصل کر سکیں اور محروموں کو حقوق

www.rahimia.org

فراہم کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد جاری رہ سکے۔ یہ ایسا عمل ہے، جسے حضورؐ نے قابل رشک قرار دیا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

[**لا حسد إلاَّ في اثنين؛ رجل أعطاه اللّٰه ما لاً فسلّطه علیٰ هلكته في الحقّ، و رجل أعطاه الحكمة، فهو يقضي بها و يعلمها.**] (90)

(دوقسم کے آدمی ہیں، جن پر بجا رشک کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جسے خدا نے دولت عطا کی اور ساتھ ہی ہمت دے دی کہ اسے حق کی راہ میں خرچ کرے۔ دوسرا وہ جسے خدا نے حکمت دے دی وہ اس کے مطابق خود عمل کرتا ہے اور اس کی تعلیم دوسروں کو دیتا ہے۔)

تعلیم و تعلّم اور لوگوں کو شعور دینے سے انہیں دین کی سمجھ اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سیاسی جدوجہد کا آغاز اور قیامِ عدل کا ماحول سازگار ہوتا ہے۔ اس بنا پر رسول ﷺ اس عمل کو خصوصی اہمیت دے رہے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث کے مضمون کو اس حدیث سے تقویت ملتی ہے:

[**كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبيآء.**] (91)

(بنو اسرائیل کی سیاست اُن کے انبیاؑ کیا کرتے تھے۔)

گویا بنو اسرائیلی انبیا اس حدیث کی روشنی میں سماجی مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

سیاسی نظام کی اہمیت اور اس میں بنیادی کردار ادا کرنے کی اہمیت پر قرآن و حدیث میں اس لیے زور دیا گیا ہے کہ اس سے ریاستی نظام کے قیام میں مدد ملتی ہے۔ اور ریاست فطرتاً ایک قومی نمائندہ جماعت ہوتی ہے جو اختیارات کو استعمال کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ریاست ہر پیدا ہونے والے مسئلے پر عوام الناس کی رائے معلوم نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ اس مقصد کے حصول کے لیے ناگزیر طور پر ایک نمائندہ حکومت کی وساطت سے عمل کرے گی۔ اس لیے نمائندہ جمہوریت کا نظریہ ایسے انتخاب کا تصور پیش کرتا ہے جس میں عامۃ الناس چند اشخاص کو چند مقررہ سالوں کے لیے اپنی نمائندگی اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے منتخب کریں۔

اگر حکمران شرعی معیارات پر پورا اترتا ہو تو پھر اس کی اطاعت لازمی اور ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مخالفت اور حکم عدولی کرنے والا گناہ گار اور سزا کا مستحق ہو گا اس لیے کہ اگر حکومت، شریعت کے احکام کے عین مطابق ہو تو یہ رسول اللہ ﷺ کے حسبِ ارشاد شہریوں کی اطاعت کی حق دار ہو سکتی ہے۔ چناں چہ حدیث مبارکہ ہے:

[**من أطاعني فقد أطاع اللّٰه، و من عصاني فقد عصى اللّٰه، و من أطاع أميري فقد أطاعني، و من عصا أميري فقد عصاني.**] (92)

(جو شخص میری فرماں برداری کرتا ہے وہ خدا کی فرماں برداری کرتا ہے۔ اور جو شخص میرا نافرمان ہے وہ خدا کا نافرمان ہے۔ اور جو شخص امیر (رئیس مملکت) کی اطاعت کرتا ہے، میری اطاعت کرتا ہے اور جو امیر کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔)

اسلام نے اپنے نظام سیاسی میں اولوالامر یا عوامی نمائندگان کو یہ بلند مقام جو دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ نمائندگان قوم

ریاست میں الٰہی قوانین کے نفاذ کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ان کا منصب اور بلند مقام اس بنا پر ہے کہ وہ قوانین الٰہی کی پابندی کریں اور عدل وانصاف کے قیام کو مقصد حیات بنائیں۔

اسلام جس سیاسی نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے اس کی حدود و قیود مکمل طور پر بیان کرتا ہے۔ چناں چہ اسی حوالے سے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

[لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق.] (93)

(اللہ کی نافرمانی کی صورت میں حکمران کی اطاعت ضروری نہیں۔)

سیاسی ذمہ داریوں کے حوالے سے علمائے اُمت کی تصریحات

سطور بالا سے یہ امر واضح ہوا کہ سیاست حسن تدبیر اور اجتماعی زندگی کے انتظام و انصرام کا نام ہے۔ سیاست' تمدنی تشکیل کے لیے درست فیصلے کرنے اور ان پر عمل درآمد کا نام ہے۔

سماجی زندگی کو کن خطوط پر تشکیل پانا چاہیے اور شریعت اسلامیہ اس ضمن میں کیا رہنمائی دیتی ہے، اس بابت علمائے اُمت نے جو تفصیلات ذکر کی ہیں اب ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

قاضی ابو یوسف (م:۱۸۲ھ/798ء) معروف عباسی خلیفہ ہارون الرشید (م:۱۹۳ھ/809ء) کو کہتے ہیں:

''و كلّ مارأيت أنّ اللّٰه تعالٰی يصلح به أمر الرّعية فافعله، و لاتؤخر، فإنّي أرجو أن يكون ذٰلک موسعاً عليه.'' (94)

(جس ''اقدام'' میں آپ سمجھیں کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ رعایا کے اُمور کی اصلاح کرے گا اس میں تاخیر نہ کیجئے مجھے امید ہے کہ اس میں وسعت ہے۔)

امام غزالی سیاست کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''استصلاح الخلق و إرشادهم إلٰی الطّريق المستقيم المنجی فی الدُّنيا و الآخرة.'' (95)

(سیاست مخلوق کی اصلاح اور رہنمائی کرنا ہے۔ اس سیدھے راستے کی جانب جو دنیا اور آخرت کی نجات کا ذریعہ ہو۔)

امام ابن تیمیہ سیاست کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''إنّ السّياسة فعل ينشی من الحاكم لمصلحة يراها، و إن لم يروا بذا الفعل دليل خبری.'' (96)

(سیاست وہ فعل ہے' جس کو حاکم، مصلحت کے پیش نظر مناسب سمجھ کر کرتا ہے۔ اگر چہ اس فعل کی کوئی دلیل مروی نہ ہو۔)

ایک اور جگہ ہے:

''إنّها القانون الموضوع لرعاية الأداب، و المصالح، و انتظام الأحوال.'' (97)

(سیاست وہ قانون ہے جو آداب و مصالح اور انتظام احوال کے لیے وضع کیا گیا ہو۔)

علامہ ابن قیم (م:۷۵۱ھ/1350ء) کہتے ہیں:

''السّیـاسة ما کان فعلاً یکون معه النّاس أقرب إلٰی الصّلاح، و أبعد عن الفساد، و إن لم یصنع الرّسول و لا نزل به وحی.'' (98)

(سیاست وہ فعل ہے کہ اس کے ذریعے لوگ صلاح سے قریب اور فساد سے دور ہوں اگر چہ اس کو رسول اللہ ﷺ نے نہ کیا ہو اور نہ اس کے لیے وحی نازل ہوئی ہو۔)

علامہ ابن خلدون کہتے ہیں:

''فالسّیاسة و الملک هی کفالة للخلق، و خلافة اللّٰه فی العباد تنفیذ أحکام فیهم.'' (99)

(سیاست اور حکومت مخلوق کی نگہداشت اور ان کے مفاد کی کفالت وضمانت کا نام ہے۔ یہ سیاست خدا کی نیابت ہے اور اس کے بندوں پر اسی کے احکام نافذ کرنے کے کام ہیں۔)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کہتے ہیں:

''انتظام الدّین یتوقف علٰی اتباع سنن النّبیّ ﷺ، و انتظام السّیاسة الکبریٰ یتوقّف علٰی الانقیاد للخلفاء فیما یأمرونهم بالاجتهاد فی باب الارتفاقات، و اقامة الجهاد، و أمثال ذلک.''(100)

(دین کا انتظام سنتِ رسول اللہ ﷺ کی اتباع پر موقوف ہے اور سیاست کبریٰ کا انتظام خلفا کی اتباع پر موقوف ہے۔ چناں چہ تدابیر ملکی اور اقامت جہاد وغیرہ میں شاہ ولی اللہ اجتہاد کا حکم دیتے ہیں۔)

یعنی سیاست کے معنی مکر وفریب اور لڑانا نہیں ہے بلکہ اس حکمت عملی کا نام سیاست ہے جو اخوة ومحبت اور اتحاد واتفاق پیدا کرتی ہے۔ سیاست دان طبقاتی کشمکش پیدا کرنے والے اور لڑانے والے کو نہیں کہا جاتا بلکہ حقیقی سیاست دان وہ ہوتا ہے جو بہترین مدبر ومنتظم ہونے کے ساتھ مصلح اور معلم اخلاق بھی ہو۔

ایسی سیاست حقوق العباد قائم کرنے کا ذریعہ بنتی ہے جو مقاصد دین وشریعت کا اہم ترین مقصد ہے۔ سیاست' مخلوق میں عدل واعتدال پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے جو مقاصد نبوت میں اہم ترین مقصد ہے۔ اس لیے امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''لا سیاسة إلاّ ما وافق الشّرع.'' (101)

(سیاست وہی معتبر ہے جو شریعت کے موافق ہو۔)

علمائے اُمت کی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں سیاست اجتماعی مسائل کے حل اور حقوق العباد کے قیام کا نام ہے۔

سیاسی نظام کے بنیادی مقاصد اور عصری تقاضوں کی اہمیت

قرآن وسنت انسانی معاشرہ کی تشکیل وتنظیم کے اساسی اصولوں کو واضح اسلوب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ چناں چہ قرآن وسنت میں معاشرے کے نظریاتی، روحانی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی کی طرح سیاسی نظام کی تشکیل کے بنیادی مقاصد کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اسی بابت قرآن وسنت کی روشنی میں علمائے اُمت نے اپنے گراں قدر نظریات کا قابل قدر اثاثہ چھوڑا ہے۔ ذیل میں قرآن وسنت کی ہدایات اور علمائے اُمت کے بُلند پایہ خیالات کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

www.rahimia.org

1۔ بعثت انبیا کا مقصد، قیامِ عدل

انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد محض مکلّفین کے احکامات بیان کرنا نہیں تھا بلکہ ایک اہم فریضہ عادلانہ اجتماعی نظام کے قیام کا انتظام و انصرام اور لوگوں کو اجتماعی روابط کی بنیاد پر منظّم کرنا بھی تھا اس مقصد کے حصول میں حائل رکاوٹوں کا انسانوں کو شعور دینا اور ان کا حل بتانا دعوت رُسل کا مشترکہ لائحہ عمل رہا ہے اس اساسی اصول دعوت کو قرآن نے بیان کرتے ہوئے کہا:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (102)

(اور ہم نے بھیجے ہیں ہر اُمت میں رسول یہ بات بیان کرنے کے لیے کہ بندگی کرو اللہ کی اور بچو ہر طاغوت سے۔)

بقول شاہ عبد القادر دہلوی (۱۲۳۰ھ/م:۱۸۱۵ء):

''طاغوت سے مراد ہڑ دنگا سرکش ہے۔ شیطان زبردست ظالم سب اس میں داخل ہیں۔''(103)

اسی مضمون کی وضاحت ایک اور آیت سے ہوتی ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (104)

(کہ ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر۔)

2۔ ظلم و فساد کا خاتمہ

مذکورۃ الصدر آخری آیت سورہ حدید کی ہے۔ سورہ حدید میں جس جگہ یہ آیت کریمہ ہے اس کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ دنیا میں لوگوں کی بدحالی اور پریشانی غلط نظامِ زندگی کی وجہ سے ہوتی ہے اور انبیائے کرام علیہم السلام نظام عدل کے ذریعے انسانوں کی اس پریشانی کو ختم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس بابت انبیائے کرام کی مکمل رہنمائی اور مدد کرتا ہے لہٰذا لوہے کی پیدائش اور اس کے فوائد کا اس سورۃ میں تذکرہ اس آخری مقصد کی وضاحت کے لیے ہے کہ استحصال پسند طبقہ کی سرکوبی کے لیے سیاسی اور معاشی قوت کے حصول کو قرآن ضروری قرار دیتا ہے۔ حاصل یہ کہ قرآن، رہبانیت یعنی سماجی ذمے داریوں سے فرار کی راہ اختیار کرنے کی بجائے ظلم کے خاتمے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کا سیاسی نظام اسی مقصد کے حصول کی راہ ہموار کرتا ہے۔ چناں چہ شاہ ولی اللہ رقم طراز ہیں:

''و كذٰلك اجمعوا (الأنبياء) علىٰ النّكاح، و تحريم السّفاح، و إقامة العدل بين النّاس و، تحريم المظالم، و إقامة الحدود علىٰ أهل المعاصى، و الجهاد مع أعداء اللّٰه، و الاجتهاد فى إشاعة أمر اللّٰه و دينهٖ. فهٰذا أصل الدّين، و لذٰلك لم يبحث القرآن العظيم عن لِمّية هٰذهٖ الأشياء إلّا ما شاء اللّٰه، فإنّها كانت مسلمة فيمن نزل القرآن علىٰ ألسنتهم، و إنّما الاختلاف فى صور هٰذهٖ الامور و أشباهها.'' (105)

(جملہ انبیائے کرام نکاح کی ضرورت، زنا کی حرمت، عدل و انصاف قائم کرنے، ظلم و جور کی حرمت، عاصی و مجرم پر حدود جاری کرنے، خدا کے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے، اللہ کے احکام اور دین کی اشاعت میں سعی و کوشش کرنے پر

www.rahimia.org

متفق ہیں، یہی دین کی اصل ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ قرآن حکیم نے ان اُمور کو پیش کرتے ہوئے اس کے ثبوت میں دلائل پیش نہیں کیے اور اگر کہیں کچھ بحث و استدلال سے کام لیا ہے تو شاذ و نادر' کیوں کہ یہ اُمور مخالفین قرآن کے نزدیک بھی تسلیم شدہ حقائق تھے اور اگر اختلاف تھا تو صرف ان اُمور کی صورتوں اور شکلوں میں تھا۔)

شاہ ولی اللہ کی اس عبارت کی روشنی میں انبیائے کرام سماجی، سیاسی اور معاشی ظلم کے خاتمہ پر متفق رہے ہیں۔ چناں چہ دوسری جگہ اس مقصد کو یوں بیان کرتے ہیں:

''**إعلم أنّ من أعظم المقاصد الّتی قصدت ببعثة الأنبياء عليهم السّلام دفع المظالم من بين النّاس، فإن تظالمهم يفسد حالهم، و يضيق عليهم، و لا حاجة إلٰی شرح ذٰلک.**'' (106)

(بعثت انبیا کے اعظم مقاصد میں سے لوگوں کے درمیان ظلم وستم کا خاتمہ کرنا ہے۔ پس اگر وہ آپس میں ظلم کریں گے تو ان کے حالات خراب ہوجائیں گے اور ان پر سخت تنگی واقع ہو جائے گی اور اس بات کی مزید وضاحت کی اب حاجت نہیں ہے۔)

قرآن حکیم ایک جگہ سماجی عدل وانصاف کے قیام پر زور دینے اور مسلمانوں کو اس مقصد کے حصول کے لیے اہل رائے و ذی عقل لوگوں کی اطاعت کی طرف توجہ دلا کر فرماتا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾ (107)

(کیا آپ نے دیکھا ان کو جو دعوی کرتے ہیں کہ ایمان لائے اس پر جو اُترا آپ کی طرف اور جو اُترا آپ سے پہلے جب کہ چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مسائل لے جائیں (طاغوت) ظالم حکمران کی طرف حال آں کہ ان کو اس بات کا حکم ہو چکا ہے کہ اس کو نہ مانیں۔)

قول وفعل کے اس تضاد کو ختم کرنے اور طاغوتی (108) طرزِ حکومت کے استیصال کے لیے ایسی عدل پسند سیاست کی ضرورت ہے جو قیام عدل کے لیے مدد اور معاون ہو۔ چناں چہ:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ (109)

(اگر اللہ ایک جماعت کے ذریعے دوسری جماعت کو شکست نہ دیتے تو زمین میں فساد برپا ہو جاتا۔)

والی آیت اسی مفہوم کو بیان کرتی ہے کہ عادل حکمرانوں کے ذریعے سے مظلوم کو ظالم سے چھٹکارا دلایا جائے۔

اقوام کی مادی اور روحانی ترقی میں اس مسئلے کی اتنی اہمیت ہے کہ فقہائے اُمت اور صوفیائے کرام اپنی نگارشات کی انتہا اور اپنی دعاءِ صبح گاہی کا مدعا اسی کو بناتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل (م:۲۴۱ھ/855ء) سے منقول ہے' فرماتے ہیں:

''**لو كنت مستجاب الدّعوات لدعوت الملک العادل، لأنّ إصلاح الملک و الشّعب فی إصلاحه، و فسادهما فی فساده.**'' (110)

(اگر میں مستجاب الدعوات ہوتا تو میں عادل حکمران کی طلب کرتا اس لیے کہ اس کی اصلاح میں ملک وقوم کی

www.rahimia.org

اصلاح ہے اور اس کے فساد میں دونوں کا فساد ہے۔)

قرآن و سنت اور علمائے اُمت کے اقوال کی روشنی میں یہ امر واضح ہوتا ہے کہ دین اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل کا اہم ہدف انسدادِ ظلم و فساد اور قیامِ عدل ہے۔

3۔ اخلاق فاضلہ کا فروغ

دین اسلام کے اجتماعی تصورات اور دینی سیاست کا اہم ہدف انسانی معاشرے میں اخلاقِ فاضلہ کو فروغ دینا ہے۔ اس ضمن میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

''أمّا الامرة البرة فیعمل فیها التقی، و أمّا الامرة الفاجرة فیستمتع فیها الشّقی إلٰی تنقطع مدّته، و تدرکه منیته.'' (111)

(اگر حکومت نیک ہو تو اس میں متقی و پرہیز گار اچھے عمل کرتا ہے اور بری حکومت ہو تو اس میں بدبخت لوگ جی بھر کر لطف اندوز ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا زمانہ ختم ہو جائے اور موت انہیں پالے۔)

اس قول سے یہ عُقدہ کھلتا ہے کہ معاشرتی اچھائیوں اور برائیوں کی جڑ نظامِ حکومت میں ہے۔ نظامِ حکومت اگر بر و تقویٰ کے اصول پر ہو گا تو عوام الناس کو نیکی کرنے اور اس پر قائم رہنے میں سہولت رہتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس صورت حال میں نیکی کرنا مشکل ہو جاتا ہے تاوقتیکہ بداخلاقی کو رواج دینے والی قوت کو دینی سیاسی قوت سے شکست دے دی جائے۔

اللہ کے نزدیک کون سا ایسا شخص ہے جس کی پیروی میں تمام قوم کو قربِ خداوندی نصیب ہو سکے۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ اس کی وضاحت کرتی ہے، ارشاد نبوی ہے:

[إنّ أحبّ النّاس إلٰی اللّٰه یوم القیامة و أدناهم منه مجلساً إمام عادل.] (112)

(تحقیق سب لوگوں میں زیادہ پیارا اللہ کے نزدیک قیامت کے دن اور بہت نزدیک بیٹھنے والا اللہ کے پاس عادل حکمران ہے۔)

چوں کہ امامِ عادل لوگوں کو نظام عدل کے ذریعے اَمن و آشتی اور خوش حالی فراہم کرتا ہے جس سے ان کی زندگی پُرسکون اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں:

سید عبدالقادر جیلانی (م: ۵٦١ھ/1166ء) تقویٰ کی تعریف عدل کے قیام کے ساتھ کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت ذکر فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (113) (اللہ تمھیں عدل و احسان کا حکم دیتے ہیں۔)

یعنی تقویٰ کا عملی اظہار قیام عدل کی جدوجہد ہے جب کہ تمام عقائد و عبادات کا منتہائے نظر تقویٰ ہے اور تقویٰ عدل کے قیام سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اسلام کے سیاسی نظام کی روح متعین ہوتی ہے۔ (114)

اجتماعی اور دینی اُمور کو اجتماعی سیاست کے ماتحت سرانجام دینے کی اہمیت آں حضور ﷺ کے ہاں اس قدر ضروری ہے کہ امام کے بغیر زندگی گزار کر جانے والے کو جاہلیت کی موت قرار دیتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

www.rahimia.org

[من مات و لیس فی عنقه بیعة، مات میتة جاهلیة.] (115)

(جب کوئی شخص ایسی حالت میں مرا کہ کسی عادل امام کے ماتحت نہ تھا تو جاہلیت کی موت مرا۔)

یہ حدیث صالح سیاسی نظام کے قیام اور اطاعت امام کے مضمون کو بہت واضح انداز سے بیان کر رہی ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

[إذا خرج ثلاثة فی السّفر فلیؤمروا أحدهم.] (116)

(جب تین افراد کسی سفر پر نکلیں تو ان میں سے ایک کو امیر بنا لینا چاہیے۔)

جب تین افراد کو اپنے اجتماعی اُمور سرانجام دینے کے لیے امیر بنانے کا حکم ہے تو ایک قوم کو اپنا سیاسی نظام بنانے کی ضرورت کیوں نہ ہوگی۔

سیاسی ذمہ داریوں کو ادا کرنا بھی واجب ہے

مسائل شرعیہ میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ اگر کوئی واجب کسی دوسرے واجب پر موقوف ہو تو موقوف علیہ بھی واجب ہوتا ہے۔ جیسے وجوب زکوۃ کے لیے مال کے نصاب کی مقدار کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح تنفیذ حدود، حفاظت ناس، قیام امن، دفع ظلم اور لوگوں کے حقوق کی فراہمی اور دیگر احکامات شرعیہ کا نفاذ واجب ہے اور اس واجب پر عمل صالح سیاسی نظام اور اس کے رہبر کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے عادلانہ سیاسی نظام کا قیام ادائیگی فریضہ کی خاطر قائم کرنا واجب ہوا اور اگر اس بات کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت سے مفاسد اور سماجی برائیوں کی جڑ یہی غلط حکومتیں بنا کرتی ہیں۔ احکاماتِ شرعیہ موقوف ہو جاتے ہیں، ظلم و ستم عام اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ ظلم و بربریت، بدحالی اور خوف نیکی کی راہ میں دیوار بن جاتا ہے۔ حکومت عادلہ سے محروم معاشرہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اور لاقانونیت کا ہر طرف دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اسی کو حضور ﷺ نے ایک حدیث مبارکہ میں یوں بیان فرمایا ہے:

[إذا ضیّعت الأمانة فانتظر السّاعة، فقیل کیف اضاعتها؟ قال: إذا وُسّد الأمر إلٰی غیر أهلهٖ فانتظر السّاعة.] (117)

(جب امانت ضائع کی جانے لگے تو ساعۃ (قیامت) کا انتظار کرو۔ کہا گیا یارسول اللہ ﷺ امانت ضائع کرنا کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا جب امر و حکومت اور سرداری نااہلوں کے سپرد کی جائے تو تم ''ساعۃ'' یعنی قیامت کا انتظار کرو۔)

''السّاعة'' (قیامت) کے تین معنی بیان کئے گئے ہیں:

(۱) ساعةِ صُغری (۲) ساعةِ وُسطٰی (۳) ساعةِ کُبریٰ.

ساعۃ صغری کسی ایک شخص کی موت کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے ''من مات فقد قامت قیامته'' جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہوگئی۔ ساعۃ وسطیٰ سے مراد قوم کی ہلاکت ہے اور ساعت کبریٰ یوم الجزا (قیامت کے دن) کو کہتے ہیں۔ اس حدیث میں

www.ranimia.org

ساعت سے مراد ساعتِ وسطی ہے۔ یعنی جب نااہلوں کے ہاتھ میں امانت آ جائے اور قوم کی سرداری کی باگ ڈور نااہلوں کے ہاتھ میں چلی جائے تو قوم کی ہلاکت اور بربادی کا انتظار کرو۔ (118)

انسانیت کو اس تباہی اور بربادی سے بچانے کے لیے اسلام عادلانہ سیاسی نظام قائم کرنے پر زور دیتا ہے۔

4۔ صنعتی ترقی و قیام امن

دین اسلام کا سیاسی نظام ان تمام اُمور کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے جو معاشرے کی اجتماعی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ چناں چہ امام غزالی مقاصد امامت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''إنّ الدّنيا و الأمن علٰى الأنفس و الأموال لا ينتظم إلاَّ بسلطان مطاع، فتشهد له مشاهدة أوقات الفتن بموت السّلاطين و الأئمّة، و إنّ ذٰلک لو دام و لم يتدارک بنصب سلطان آخر مطاع دام الهرج، و عمّ السّيف، و شمل القحط، و هلکت المواشی، و تعطّلت الصّناعات، و کان کلّ من غلب سلب، و لم يتفرّغ أحد للعبادة و العلم أن بقی حيا، فکان و جوب الإمام من ضروريات الشّرع الّذی لا سبيل إلٰی ترکه.'' (119)

(دنیا میں جان و مال کی حفاظت اور قیام امن کی ضمانت مسلمہ حکمران کے بغیر نہیں دی جاسکتی۔ اس بات کا مشاہدہ حکمرانوں اور آئمہ کی اموات کے وقت اٹھنے والے فتنوں کی شکل میں کیا جاسکتا ہے لہٰذا اس بات کا بارہا مشاہدہ کیا گیا کہ اگر اس حالت کو طویل زمانہ برقرار رکھا جائے اور کسی دوسرے امام کو مقرر نہ کیا جائے تو نقصان بڑھتا رہتا ہے۔ قتل و غارت عام ہو جاتی ہے۔ قحط سالی مسلط ہو جاتی ہے۔ صنعت و حرفت کی سرگرمیاں معطل ہو جاتی ہیں۔ اور ہر طاقت ور، کمزور کو دبوچ کر ہر چیز کا مالک بن جاتا ہے۔ اگر عام لوگ ان آفتوں سے اپنی زندگی کو بچا بھی لیں تب بھی وہ عبادت اور تعلیم و تعلم کے حصول کے لیے فرصت نہیں پاتے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ دین اور ''امام'' لازم و ملزوم ہیں اس لیے امام کا ہونا ضروریات دین سے ہے جس کو ترک کرنے کا کوئی شرعی جواز موجود نہیں۔)

گویا اسلام کا تصور امامت انسانوں کے مادی اور روحانی حقوق کا ضامن ہے۔ امام غزالی مذکورہ الصدر اُمور کے قیام کے لیے قیام امامت لازم قرار دے رہے ہیں۔

5۔ اشاعت دین وریاستی انتظام وانصرام

قرآن حکیم کی متعدد وہ آیات حدود جو تنفیذ احکام کا مطالبہ کرتی ہیں اس بات کی مقتضی ہیں کہ عادل امام کا تقرر ہو، تاکہ مقاصد قرآن حاصل ہوسکیں اور احکاماتِ الٰہی کی عملی تعبیر سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں ممکن ہوسکے ورنہ وہ احکامات جن پر سماجی عدل و انصاف کا قیام حلال و حرام کی تمیز اور حیا اور عفت کا غلبہ قرآنی نگاہ میں ناگزیر ہے۔ نفاذ کی اس قوت کے بغیر ناممکن ہے کہ طاغوت صرف قوت کی زبان سمجھتا ہے۔ (120) ورنہ عوام تو ہر حکومت کو قبول کر ہی لیتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ظلم کو مجبوراً اور عدل کو بخوشی البتہ آخر الذکر ان کے دل کی پکار ہوتی ہے۔

www.rahimia.org

حضور ﷺ نے جب مدینہ منورہ میں اپنی حکومت قائم کی تو آپ ﷺ اس حکومت کے پہلے امام تھے۔ تب آپ ؐ نے اپنے اختیارات سے دین کی نصرت کی لہٰذا اوس و خزرج سے صلح کر کے اپنی عادلانہ امامت کو سیاسی استحکام بخشا۔ مواخات مدینہ قائم کر کے اسلامی حکومت کے اندرونی نظام کو مضبوط کیا۔ اسی طرح لشکروں کا انتظام، سیاسی، سماجی، تمدنی اور مالی اُمور کے فیصلے کئے اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اپنی نیابت میں امرا متعین کئے۔ یہ تمام اُمور اسی وقت ممکن ہو سکے جب آپ ﷺ کو مدینہ منورہ میں ایک بااختیار امامت قائم کرنے کا موقع ملا ورنہ مکہ مکرمہ میں یہ تمام کام سرانجام دینا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اسی کو قرآن بعثِ نبوی ؐ کے مقاصد میں:

﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (121) (اس دین کو تمام نظام ہائے حیات پر غالب کرنا۔)

بیان کرتا ہے۔

حکومت عادلہ اس مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہے تاکہ وہ قوم کے سیاسی، سماجی و معاشی اور ملی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنی کوشش صرف کرے۔ جس کی مختصر وضاحت یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت عادلہ سماجی معاملات میں ایسی قانون سازی کرے جس میں لوگوں کے باہمی معاملات خواہ فرد کے فرد سے ہوں یا فرد کے جماعت سے یا جماعت کے جماعت سے ہوں۔ اسی طرح اس میں عائلی زندگی کے جملہ مسائل شامل ہیں تو امام عادل ان اُمور اور حقوق کو قانونی تحفظ دے کر جزا و سزا کے لیے عدالتی نظام کو وضع کرے۔ اسی طرح قومی اداروں (مقنّنہ، انتظامیہ، عدلیہ) کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے مضبوط سیاسی نظام تشکیل دے اور لوگوں کی ضروریات زندگی کی کفالت اور تکمیل کے لیے باہمی رضامندی اور عدل پر مبنی اصول تجارت طے کرے اور ہر قسم کے ظلم و استحصال کا سد باب کرے۔ حرام معیشت، رشوت، سود اور ناجائز منافع خوری جیسے رجحانات کا خاتمہ کرے اس کے ساتھ ساتھ قوم کے دینی اور مذہبی رجحانات کا مکمل خیال رکھے۔ شعائر اسلام اور دیگر دینی تقاضوں کا خیال رکھ کر قوم کو بے دینی کے حملوں اور دشمن کی دست برد سے بچانے کا اہتمام کرے اور دین و ملت کی شان و شوکت پیدا کرے۔ اساسی اور بنیادی نوعیت کے شعبوں میں قانون سازی کرنے کے بعد اس کے نفاذ کو ہر ممکن یقینی بنائے تاکہ قوم کو حسنة في الدّنيا (دُنیوی کامیابی) اور حسنة في الآخرة (اُخروی نجات) کو یقینی بنانے کا پورا موقع اور سہولت میسر آ سکے۔ حقیقت میں یہی امامت عدل کے قیام کا مفہوم، مقصود اور منتہائے نظر ہے اور اسلام اللہ پر ایمان رکھنے والوں سے اسی جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے تاکہ مخلوق خدا اَمن و آشتی اور خوش حالی کی زندگی گزارے۔ وہ کسی کی محتاج، غلام اور کسی سے خوف زدہ نہ ہو تاکہ قرب خداوندی کی جملہ انواع کو اَمن و سکون اور رغبت کے ساتھ اختیار کر سکے۔ اس لیے کہ ظلم و زیادتی، خوف و ہراس اور معاشی بدحالی کے ماحول میں انسان کے جسم و روح دونوں پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

عادل حکمرانوں کی اطاعت کی اہمیت اور ضرورت

اب تک کی بحث سے قرآنی رجحان اور اسلوب یہ متعین ہوتا ہے کہ قرآن عادلانہ حکومت اور عادل حکمران کو اقوام کی سیاسی زندگی میں بہت اہمیت دیتا ہے۔ مذکورہ بالا آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیات مختلف اسالیب کے ساتھ اس مسئلہ کی اہمیت اور مقاصد متعین کرتی ہیں۔ چناں چہ سورۃ النسا میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ ''اولوالامر'' (122) کی اطاعت کو ذکر

کیا گیا ہے۔ امام طبری (م:۳۱۰ھ/923ء) اولی الامر کی تفسیر حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت کی بنا پر ''امرا'' سے کرتے ہیں ان کی عبارت ہے:

''إنّ أولی الأمر هم الأمراء.''(123) (اولوالامر سے مراد امرا ہیں۔)

پھر امام طبری کہتے ہیں:

''أولی الأقوال فی ذٰلک بالصّواب قول من قال: هم الأمراء و الوُلاة فیما کان لِلّٰه طاعة و للمسلمین مصلحة.''(124)

(تمام اقوال میں صحیح قول یہ ہے کہ اولی الامر سے مراد وہ امرا اور والیان حکومت ہیں جن کی پیروی میں اطاعتِ الٰہی اور مصلحت مسلمین ہو۔)

امام قرطبی (م:۶۷۱ھ/1273ء) کی بھی یہی رائے ہے۔(125) زیرِ تبصرہ آیت سے استدلال یوں بنتا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں پر اطاعت امرا کو واجب قرار دیا ہے اور ''امر'' وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا سیاسی نظام کو درست خطوط پر قائم رکھنے کے لیے نصب ''امام'' واجب ہے، اس لیے کہ اللہ ایسے کام کا حکم نہیں دیتے جو محال ہوں اور مستحب کو واجب قرار نہیں دیتے۔ لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ عادلانہ نظام کے قیام کے لیے عادل امام منتخب کریں۔ اسی بات کو عبداللہ ابن مبارک (م:۱۸۱ھ/797ء) نے منظوم شکل میں یوں بیان کیا:

لولا الخلیفة لمن تامن لنا سبل
و کان أضعفنا نهبا لا قوانا

(اگر خلیفہ نہ ہوتا' تو ہم میں سے کسی کے لیے راستے محفوظ نہ رہتے اور ہمارے کمزور لوگ قوی لوگوں کے سامنے گریہ وزاری کرنے لگتے۔)(126)

چوں کہ خلیفہ اور امام اجتماعیت پرور ماحول قائم کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے اور اھل الرائے کی مشاورت کے ساتھ اجتماعی حقوق کو قائم کرتا ہے، اس لیے ایسا حکمران جو عدل پسند سیاست کو رواج دے وہی دراصل عوامی نمائندہ حکومت ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا مضمون دراصل قرآن کی ایک آیت مبارکہ کا مضمون ہے۔ چناں چہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ﴾ (127)

(بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں (اقتدار کی امانت) اس کے اہل کے سپرد کردو۔)

اس آیت میں کسی مخصوص طبقہ کا ذکر نہیں کہ جس کو انتخاب کا حق دیا گیا ہو بلکہ سلطنت کے جملہ افراد کو مخاطب کیا گیا ہے اور ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس عمل میں حصے دار بنیں اور اپنی ذمے داری نبھاتے ہوئے اہل لوگوں کو منتخب کریں۔ سربراہ حکومت کی معاونت اور مشاورت کے لیے ادارے کا وجود قدیم زمانے سے کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا ہے۔ قدیم بادشاہوں کے تذکرہ کے ضمن میں قرآن حکیم نے ایسے ادارہ کو ''ملاء قوم''(128) کے نام سے ذکر کیا ہے۔

اس ادارہ کو قرآن ''اولوالامر''(129) کے نام سے بھی ذکر کرتا ہے۔

www.rahimia.org

قرآن میں اولوالامر کی اصطلاح مسلم عادل حکمرانوں کے ساتھ خاص ہے۔ اولوالامر سے مراد وہ باصلاحیت، ذی عقل، ذی شعور لوگ ہوتے ہیں، جنہیں عوامی نمائندگی کی ذمے داری دی گئی ہو۔[130]

امام فخرالدین رازیؒ (۶۰۶ھ/1209ء) اور ماوردی نے انہیں اہل الحل والعقد کہا ہے۔[131]

اتفاق اُمت کی بنا پر یہ بات قطعی ہے کہ مآخذ قانون کتاب اللہ وسنت رسول ﷺ ہیں۔ جن اُمور کی بابت قرآن وسنت میں صریح احکام موجود ہیں ان میں کسی نئے اجتہاد اور قانون سازی کی نہ ضرورت ہے نہ اجازت۔

مسلمانوں کے اَرباب حل وعقد اور ان کے اولوالامر قطعی الثبوت، قطعی الدلالۃ احکام کے اجرا و نفاذ کا اختیار تو رکھتے ہیں' وہ انہیں کالعدم کرنے، ترمیم و تنسیخ اور نئی قانون سازی کا اختیار نہیں رکھتے البتہ احکام کی بقیہ تین اقسام یا وہ معاملات جن کے بارے میں قرآن وسنت میں سکوت اختیار کیا گیا ہے ان میں اُمت کو قانون سازی کا پورا حق اور اختیار حاصل ہے۔ اجتہاد و قانون سازی کا یہ دائرہ بہت وسیع ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن وسنت میں قانون سازی پر اصولی رہنمائی دی گئی ہے۔ جہاں تک قوانین کی تفصیلات و جزئیات کا تعلق ہے انہیں قرآن وسنت میں ایک محدود دائرے میں ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن وسنت کا یہ اسلوب اس بنا پر بہت مفید ہے کہ کسی بھی دور میں قانون اسلام میں تعطل، جمود اور معروضی حالات سے بیگانگی کا تأثر نہیں اُبھرتا کیوں کہ سماجی، سیاسی حالات ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ سماجی وسیاسی حالات کا تعلق گرد و پیش اور حالات زمانہ کے ساتھ ہے۔ اس لیے ان حالات و زمانہ کا خیال رکھ کر قرآن وسنت کی اصولی رہنمائی کی روشنی میں اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کے منشا و مزاج کے مطابق قانون سازی کا اختیار اُمت کے ارباب حل وعقد اور اہل الرائے کے سپرد کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی منشا اور حالات و زمانہ کا تقاضا ہم آہنگ رہے۔

اس اِجتہاد اور قانون سازی کو بھی عملی شکل خود قرآن وسنت نے دی ہے۔ اسے انفرادی اور گروہی تصور کی بجائے مکمل شورائی نظام کے قالب میں خود قرآن وسنت نے ڈھالا ہے۔ چناں چہ مشاورت کی ضرورت و اہمیت اس کی عملی نوعیّتوں اور کئے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کے حوالے سے قرآن وسنت میں صریح احکام موجود ہیں۔ دین اسلام کا یہ شورائی نظام مغربی جمہوریتوں کے نظامِ قانون سازی سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور اجتماعیت کی حقیقی روح کو لیے ہوئے ہے۔ قانون سازی کرنے والوں کے علم وفکر، عمل و کردار، عوامی اور اجتماعی ضرورتوں کے لحاظ اور اجرا قانون کے تمام ضروری قواعد قرآن وسنت میں واضح کر دیئے گئے ہیں۔

سیاسی نظام میں عصری تقاضوں کی اہمیت

فقہا نے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے اجتہاد کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ بدلتے حالات میں دینی رہنمائی سے اُمت محروم نہ رہے۔ علامہ شاطبی (م:۷۹۰ھ/1388ء) نے اِجتہاد کی یہ شرط لگائی ہے:

''إنّما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتّصف بوصفين: أحد هما مقاصد الشّريعة علٰى كمالها، و الثّانى التّمكّن من الاستنباط بناء علٰى فهمهٖ فيها.'' [132]

(اجتہاد کا درجہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس میں دو صفتیں پائی جاتی ہیں:

www.rahnuma.org

(۱) مقاصدِ شریعت سے پوری واقفیت ہو اور (۲) اس واقفیت کے مطابق استنباط کی قدرت ہو۔

جن مسائل کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے وہ کئی انواع کے ہو سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ محض دینی و شرعی علوم سے متعلق ہوں۔ کئی مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کا فنون اور عصری علوم سے تعلق ہوتا ہے لیکن ان سے متعلق شرعی حکم کا اِدراک ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً بجٹ سازی' یہ اقتصادی اُمور کے ادراک کے ساتھ ریاضی، شماریات، سماجی اور سیاسی معاملات سے تعلق رکھتا ہے، تو بجٹ تفصیلات ریاضی اور شماریات کا ماہر تیار کر سکتا ہے۔ لیکن کئی شرعی سوالات کا حل اس کے پاس نہ ہوگا تو ایک ہی وقت میں ایک ہی کام کے لیے دینی و عصری علوم کے ماہرین کا باہمی تعاون و تناصر ضروری ہے۔ ظاہر ہے شرعی تقاضوں کا لحاظ محض شماریات کا ماہر نہیں رکھ سکتا۔ اسی بنا پر امام شاطبی کہتے ہیں:

''إنّ الشّريعة مبنيةٌ علىٰ اعتبار المصالح، إنّما اعتبرت من حيث وضعها الشّارع كذٰلک لا من حيث إدراک المكلّف.'' (133)

(یہ بات مسلم ہے کہ شریعت کا دارومدار بندوں کے مصالح پر ہے لیکن مصالح کا اعتبار اس نہج پر ہوگا جس نہج پر شارع نے اعتبار کیا ہے محض بندوں کی سمجھ بوجھ اور ان کی بنائی ہوئی بساط کے لحاظ سے مصالح کا اعتبار نہ ہوگا۔)

ظاہر ہے انسانوں کی ضروریات کا تعین اور ان کی شرعی حیثیت، علوم عصریہ و دینیہ کے ماہرین باہمی تعاون کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں لیکن یہ کام دقت نظر اور وسعت نظر چاہتا ہے اور اس کے لیے عصری مسائل کی پہچان عرف و رواج کا ادراک لازمی ہے کیوں کہ کسی نئے مسئلے کے حل کے وقت گرد و پیش کے حالات اور عرف و رواج کا اعتبار ضروری ہے۔ صاحب ھدایۃ کہتے ہیں:

''ما لم ينصّ عليه فهو محمول علىٰ عادات النّاس لأنّهما دالّة.'' (134)

(جس پر شرعی دلیل موجود نہ ہو اس کا فیصلہ لوگوں کی عادت کے موافق ہوگا کہ اس کے ذریعے رہنمائی ملتی ہے۔)

عقود رسم المفتی کا شعر نمبر ۶۹ ہے:

و　العرف　فی　الشّرع　له　اعتبار
لـذا　عـلـيـه　الـحـكـم　قـديـدار

(شریعت میں عرف معتبر ہے اسی لیے کبھی اس پر حکم کا مدار ہوتا ہے۔)(135)

نئی قانون سازی کے لیے یہ بنیادی اصول ہے۔ جب عرف و عادت کی بنا پر شرعی اصولوں کی روشنی میں سیاسی نظام تشکیل پاتا ہے تو یہی منشائے خداوندی ہوتی ہے۔ قاضی ابو یوسف کہتے ہیں:

''و أرجوا أن يكون ذٰلک موسعاً عليه فكيف ماشاء من ذٰلک فعل.'' (136)

(مجھے امید ہے کہ حکومت جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گی اس کے لیے وسعت اور گنجائش ہے۔)

یعنی حالات کے مطابق عملی نظام کی تشکیل میں کوئی شرعی پابندی اور رکاوٹ نہیں ہے کیوں کہ جب لوگوں کی ضرورت کسی ایسے طریقے سے پوری ہو جس سے کوئی شرعی حکم نہ ٹوٹتا ہو تو شریعت اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی بلکہ لوگوں کو اپنے ماحول

www.rahimia.org

اور رواج کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتی ہے۔ اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"النّاس أشبه بزمانهم من أسلافهم." (137)

(اپنے اسلاف کے مقابلہ میں لوگ اپنے زمانے کے زیادہ مشابہہ ہوتے ہیں۔)

"لأنّ اعتناء الشّرع بالمصالح العامّة أوفر واكثر من اعتنائه بالمصالح الخاصّه." (138)

(کیوں کہ شریعت میں مصالح خاصہ کے مقابلہ میں مصالح عامہ کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔)

علامہ ابن قیم کہتے ہیں:

"إن مقصود إقامة العدل بين عباده و قيام النّاس بالقسط فأىّ طريق استخرج بها العدل و القسط، فهى من الدّين ليست مخالفةٌ لهٗ." (139)

(شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں کے درمیان عدل وانصاف کا قیام ہے جس طریق کے ذریعے عدل وانصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔)

اسی بنا پر انبیائے کرام علیہم السلام کسی قوم میں مبعوث ہوتے تو ان کی خرابیوں کی اصلاح کردیتے یا ختم کردیتے اور جو ان کی خوبیاں ہوتی تھیں ان کو برقرار رکھتے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"فإذا حدثت النّبوّة فى اولآئک القوم لا تفنى تلک العادة بالمرّة و لا تستأنف ايجاد عادة اُخرىٰ، بل يميز النّبىّ من العادات ما كان علىٰ القاعدة موافقاً لما يرضى اللّٰه سبحانهٗ فيبقيه و ما كان منها بخلاف ذٰلک فيغره بقدر الضّرورة." (140)

(پس جب کسی قوم میں نبوت ظاہر ہوتی ہے تو وہ بیک قلم ان کے سماجی ڈھانچے کو ختم نہیں کر دیتی اور نہ ہی کوئی بالکل نیا یا اجنبی سماجی ڈھانچہ ان میں لا کھڑا کرتی ہے بلکہ نبی اس اصولی بات کو سامنے رکھتا ہے کہ جو سماجی اقدار الٰہی مرضیات کے تابع ہوتی ہیں انہیں باقی رکھتا ہے اور جو اس کے خلاف ہوں ان کی مناسب اصلاح کرتا ہے۔)

گویا کسی قوم کے اجتماعی نظام کو نبوت حرف غلط کی طرح مٹا نہیں دیتی بلکہ اس کے مفید اور صالح اجزا کو برقرار اور قائم رکھتی ہے۔ سیاسی نظام کی تشکیل کے لیے یہ دینی اصول ہر معاشرے اور ہر زمانے میں دین کو ناگزیر اور قابل قبول بناتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں کسی بھی پُرفتن دور اور نہایت بگڑے ہوئے نظام میں دینی تصورات بند گلی میں ایک کھلا دَر ثابت ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:

"و اعلم أنّه إنّما اختلفت شرائع الأنبياء عليهم السّلام لأسباب و مصالح، و ذٰلک أنّ شعائر اللّٰه إنّما كانت شعائر لمعدّات وأنّ المقادير يلاحظ فى شرعها حال المكلّفين و عاداتهم." (141)

(نبی کی شریعت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی مزاج آشنا ہوتی ہے جس میں پیغمبر پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنی ہدایات میں قوم کی عادات کا لحاظ رکھتی ہے۔)

شاہ ولی اللہ دوسری جگہ کہتے ہیں:

www.rahimia.org

''و من سيرتهم (الأنبياء) أن لا يكلّمو النّاس إلاَّ علٰى قدر عقولهم الّتى خلقوا عليها و علومهم الّتى هى حاملة عندهم بأصل الخلقة.'' (142)

(انبیائے کرام کی یہ بھی شان ہوتی ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی خلقی اور پیدائشی عقل کے مناسب حال گفتگو کریں اور انہی علوم کے مطابق گفتگو کریں جو لوگوں کو ان کی اصل خلقت کے اعتبار سے حاصل ہیں۔)

اس بنا پر ضروری ہے کہ ان تمام ماہرین کو قانون سازی میں شامل کیا جائے جو حالات زمانہ، انسانی ضروریات، مادی اور طبعی تقاضوں کو نسبتاً بہتر جانتے ہوں۔

علامہ شاطبیؒ نے عصری تقاضوں کے لحاظ کے لیے یہ شرط لازم قرار دی ہے:

''الملاء مة لمقاصد الشّرع بحيث لا تنافى أصلاً من أصوله و لا دليل من دلائله.'' (143)

(مصلحت مقاصد شرع کے مناسب ہو اور کسی اصل و دلیل کے منافی نہ ہو۔)

علمائے اُمت کے ان خیالات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دینی سیاست قومی اور عوامی مسائل کو روح عصر کے مطابق حل کرنے کا نام ہے۔

سیاسی نظام میں موقع و محل کی رعایت

ایک مرتبہ معروف اُموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے صاحبزادہ عبدالملک (م:۱۰۱ھ/720ء) نے مختلف قوانین کے نفاذ میں تاخیر پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا:

''مالک لا تنفذ الامور فو اللّٰه ما اُبالى لو أنّ القدور غلت بى و بک فى الحقّ.''

(آپ کو کیا ہو گیا کہ آپ احکام نافذ نہیں کرتے۔ خدا کی قسم! اگر حق کے معاملے میں ہانڈیوں کو اُبال آ جائے جب بھی میں اس کی پرواہ نہیں کرتا ہوں۔)

جواب میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا:

''لا تعجل يابنىّ! فإنّ اللّٰه ذمّ الخمر فى القرآن مرّتين، فحرّمه فى الثّالثة، و إنّى أخاف أن احمل الحق على النّاس جملةً فيدفعوه جملةً. فيكون من ذا فتنة.'' (144)

(برخوردار جلدی نہ کرو اللہ نے قرآن حکیم میں دو مرتبہ شراب کی برائی بیان کی اور تیسری مرتبہ اس کو حرام کیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر حق لوگوں پر یک بارگی مسلط کر دوں تو وہ اس کو یک بارگی اتار پھینکیں گے اور اس سے مستقل فتنہ ہوگا۔)

شریعت نے دنیوی مصالح کے لحاظ کو جو اہمیت دی ہے اس کا اندازہ ابن تیمیہ کی اس عبارت سے کیا جا سکتا ہے:

''إنّ النّفوس لا تقبل الحقّ إلاَّ بما يستعين به من حظوظها الّتى هى محتاجه إليها، فتكون تلک الحظوظ عبادة.'' (145)

(دنیوی زندگی میں جن چیزوں کی احتیاج ہے اور جو ممد و معاون ہیں ان کے بغیر لوگ حق کو نہیں قبول کرتے۔ اس

www.rahimia.org

بنا پر دنیوی حظوظ بھی عبادت میں شمار ہوں گے۔)

اسی لیے فقہا یہ ضابطہ بیان کرتے ہیں:

''و ما لا یتمّ الواجب إلاَّ به فهو واجب. (146)

(جس کے بغیر واجب کی ادائیگی مکمل نہ ہو وہ بھی واجب ہے۔)

علمائے اُمت کے ان اقوال سے یہ اَمر واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں عصری تقاضوں اور روح عصر کا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس وسعت نظری نے دین اسلام کو آفاقیت اور ہمہ گیری بخشی ہے۔

حوالہ جات

1. ابن الاثیر، عزالدین، ابوالحسن علی (م:۱۲۳۳ء) النهایة فی غریب الحدیث والاثر. مصطفی البابی الحلبی، القاهره. ۱۳۰۰ھ. ۲ : ۴۲۱

2. ابن منظور، الافریقی، مصری (م: ۷۱۱ھ) لسان العرب. طبع دارصادر بیروت. س. ن. ۲ : ۱۰۸

3۔ الماوردی، علی بن محمد (م:۴۵۰ھ)الاحکام السلطانیه والولایات الدینیة. ن: شرکه مکتبه و مطبعة مصطفی البابی الحلبی، القاهرة. ط: الثالثة ۱۳۹۳ھ۔ب:۱:۰۳

4۔ ایضاً:ب:۴:۱۳

5۔ الاصفهانی، راغب (م:۵۰۲ھ)الذریعه الی مکارم الشریعه. دارصادر. س. ن. ب:۸:۱۸

6۔ الغزالی، محمد بن محمد، ابو حامد (م:۵۰۵ھ)احیاء علوم الدین. دارالمعرفه للطباعة والنشر، بیروت، لبنان. س. ن. ۱:۳۱

7. نفس المکان

8۔ شاہ ولی اللہ(م:۱۷۶۲ء)حجة الله البالغه (عربی) نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔س۔ن۔۱:۴۴

9۔ شاہ اسماعیل،شہید،مولانا (م:۱۸۳۱ء) منصب امامت۔ گوشۂ ادب چوک انارکلی، لاہور۔1955ء۔۲۲

10. الماوردی، الاحکام السلطانیه. ۵

11. الجوینی، ابوالمعالی، عبدالملک (م:۴۷۸ھ) غیاث الامم فی التیاث الظلم. ن: شرکت مکتبه و مطبعة مصطفی البابی الحلبی، قاهره. ط: ثالثا ۱۳۹۳ھ. ۱۵

12. ابن خلدون، عبدالرحمن، علامه (م:۸۰۸ھ) تاریخ ابن خلدون المسمی بکتاب العبر و دیوان المبتدأ و الخبر فی ایام العرب و العجم و البربر و من عاصر هم من ذوی السلطان الاکبر. مکتبه ندارد. ط: ۱۳۹۱ھ. ۱۹۷۱ء. ۱ : ۵۹

نوٹ:۔عربی کا یہ نسخہ ادارہ علوم اثریہ۔ مبارک مسجد منٹگمری بازار فیصل آباد میں موجود ہے اس پر سن کے علاوہ مکتبہ درج نہیں ہے۔

13. ابن الحزم، علی بن احمد، الظاهری (م:۴۶۰ھ) الفصل فی الملل و النحل. ن: دارالمعرفة للطباعة والنشر، بیروت. ط: ثانیه ۱۳۹۵ھ. ۴ : ۹۰

www.rahimia.org

14۔ القرآن:۲:۲۵۵
15۔ ابن منظور، لسان العرب۔۵:۱۳۲
16۔ القرآن:۷:۱۶۹
17۔ القرآن:۶:۱۶۶
18۔ مقدمہ ابن خلدون۔۱:۱۵۹
19۔ شاہ ولی اللہ، التفهيمات الٰهيه. اکادیمیۃ الشاہ ولی اللہ، حیدرآباد، سندھ۔ 1997ء۔۸
20۔ شاہ ولی اللہ، ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء. نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔س۔ن۔۱:۱۳
21۔ القرآن:۳۸:۲۶
22۔ شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغه. ۱:۸۴
23۔ ابن منظور، لسان العرب۔۵:۱۳۲
24۔ ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، اردو ترجمہ از مولانا محمد عبدالشکور فاروقی مجددی، ج1، ص36، کتب خانہ آرام باغ، کراچی۔
25۔ ابن منظور، لسان العرب:۱:۱۵۲
26. الاصفهانی، مفردات القرآن. ۱:۴۸
27. اردودائرة معارف اسلاميه. ۳:۱۶۱
28. مسند احمد، ک: مسند العشره المبشرين بالجنة، ب: مسند علی، حديث نمبر ۸۱۷
29۔ القرآن:۴:۵۹، ۴:۸۳
30. البخاری، الجامع الصحيح، ک: الاحكام، ب: قول الله تعالٰی: اطيعوا الله و اطيعو الرسول و اولی الامر منكم. ۳:۲۵۷، حديث نمبر 6718
31. ابن سعد، ابو عبدالله، البصری، محمد منيع (م: ۲۳۰ھ) الطبقات الكبرى. ن: دار بيروت للطباعة و النشر بيروت، لبنان. ط: ۱۳۹۸ھ. ۳: ۲۸۱
32. ملاحظه هو: اردو دائره معارف اسلاميه. ۳:۲۶۲
33. الاصفهانی، مفردات القرآن. ۱: ۳۱۲، ۳۱۳
34. النووی، يحی بن شرف الدين (م: ۶۷۶ھ) روضة الطالبين. المكتب الاسلامی بيروت. س. ن. ۱۰ : ۴۹
35. مقدمه ابن خلدون، ۱ : ۱۵۹
36. نفس المكان
37. ابوزهره، محمد (م: ۱۹۷۴ء) تاريخ المذاهب الاسلاميه. ن: دارالفكر العربی. س. ن. ۱: ۲۱
38۔ الاصفهانی، مفردات القرآن. ۱:۴۹۰
39. القرآن: ۴: ۸۹
40. ابن منظور، لسان العرب. ۷: ۲۳۱
41۔ القرآن:۱۷:۸۰

42. الاصفهانی، مفردات القرآن. ۱: ۴۹۰
43. الترمذی، ابوعیسی (م: ۲۷۹ھ) السنن، ک: الفتن، حدیث نمبر 2224
44۔ الاصفہانی، مفردات القرآن۔۲:۱۰۰۹
45۔ ایضاً:۱:۱۰۱۰
46۔ القرآن:۱:۳
47۔ القرآن:۴۰:۱۶
48۔ القرآن:۱۲:۴۳
49۔ القرآن:۱۸:۷۹
50۔ القرآن:۱۱۴:۲
51. الاصفهانی، مفردات القرآن. ۲: ۱۱۱۲
52. شاه ولی الله، البدور البازغه. اکادیمیة الشاه ولی الله صدر حیدرآباد سنده. 1970ء. ۱۱۱
53۔ ابن منظور، لسان العرب۔ ۸:۲۰۹
54۔ المنجد، جدید عربی اردو لغات، دارالاشاعت، کراچی۔ جولائی 1975، مادہ؛ صدر، لسان العرب، 446:4
55. المورد، قاموس، انکلیزی، عربی . اردو از منیر البعلبکی، دارالعلم للمدین، بیروت، 1977ء
55۔ ابن منظور افریقی، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، دارالصاد، بیروت، ل بنان، 1956، ص:92,91
57۔ جہانگیر اردولغت، وصی اللہ کھوکھر، جہانگیر بکس، مادہ ری ے۔
58. Encyclopedia of Social Sciences, New Yark, Vol.14, P:328
59. ابو النصر محمد فارابی، آراء اهل المدینة الفاضلة، المطبع السعادة، مصر .1906ء، ص:26
60. شاه ولی الله، قطب الدین، حجة الله البالغه، بیروت، لبنان، 161:1
61. شاه ولی الله، البدور البازغه، تحقیق و تقدمة، دکتور صغیر حسن المعصومی، اکادیمیة الشاه ولی الله، حیدرآباد، 1970ء، ص:91
62. الاعراف، 54
63. الماوردی، الاحکام السلطانیه، ص:2
64. الحج، 41
65. الحدید، 25
66. البخاری، الجامع الصحیح، 3965، مسلم، 3196
67. النساء، 58
68. مسلم ، الجامع الصحیح، 1825
69. مسلم جامع الصحیح، کتاب الامارة، 3408
70. البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الزکوٰة، 267
71. الذاریات، 19

www.rahimia.org

72. ابن قیم، زادالمعاد، 57:1
73. ابن حزم، محلی، ص:157
74. Constitution of Pakistan , P-27
75. Soltau, An introduction to politics, Longman,London.1968,P-168
76. Constitution of Pakistan,P-15
77۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ۹:۱۱
78۔ القرآن: ۲۵:۵۷
79۔ القرآن: ۱۱۶:۱۱
80۔ القرآن: ۱۷:۳۱
81۔ القرآن: ۷۹،۷۸:۵
82۔ القرآن: ۱۰۴:۳
83۔ القرآن: ۱۸،۱۷:۹۶
84۔ القرآن: ۲۵:۸
85۔ الترمذی، ابوعیسی، السنن، ابواب الجهاد، ب: ماجاء فی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر، حدیث 2169
86. ابوداؤد، سجستانی، سلیمان بن اشعث(م:۲۷۵ھ)السنن، ک: الملاحم، ب: الامر والنهی، حدیث نمبر 4338
87. ابوداؤد، السنن، ک: الملاحم، ب: الامر و النهی، حدیث نمبر 4338
88. ابوداؤد، السنن، ک: الملاحم، ب: الامر و النهی. حدیث نمبر 4336
89۔ القرآن: ۱۱۰:۳
90۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: العلم، ب: الاغتباط فی العلم والحکمة، حدیث نمبر 73
91. المسلم، نیشاپوری، ابو الحسین، مسلم بن حجاج (م:۲۶۱ھ)الجامع الصحیح، ک: الاماره، حدیث 3430
92۔ المسلم، الجامع الصحیح، ک: الامارة، ب: وجوب طاعة الامر فی غیر معصیة و تحریمها فی المعصیة، حدیث 1835
93۔ النسائی، الجامع الصحیح، ک: الامارة، ب: وجوب طاعة الامر فی غیر معصیة و تحریمها فی المعصیة، حدیث 1218
94۔ ابو یوسف، قاضی، یعقوب بن ابراهیم (م:۱۸۲ھ) کتاب الخراج. ادارة القرآن للطباعة و النشر للتوزیع کراچی۔ ۱۹۸۷ء۔ ۱۱۵
95۔ الغزالی، احیاء العلوم. ۱: ۹
96۔ ابـن تیـمیـه، احـمد بن عبدالحلیم (م:۷۲۸ھ)السیـاسة الشـرعیه (ترجمہ اردو: محمد اسماعیل گودھروی) ن: محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب کراچی، س۔ن۔ ۸۷
97۔ ایضاً: ۵۹
98۔ ابن قیم، الجوزیة، محمد بن ابی بکر (م:۷۵۱ھ)الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة. دارالباز للنشر والتوزیع، مکة المکرمة. س۔ن
99۔ مقدمہ ابن خلدون۔ ۱۱۳

100۔ شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغه. ۱:۱۷۰
101۔ ابن القیم، الطرق الحکمیة.
102۔ القرآن: ۳۶:۱۶
103۔ شاہ عبدالقادر (م:۱۸۱۵ء) موضح القرآن۔ تاج کمپنی لمٹیڈ کراچی۔ س۔ ن۔ ۳۲۷
104۔ القرآن: ۲۵:۵۷
105۔ شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغه. ۱:۲۱۷
106۔ ایضاً: ۱۵۱:۲
107۔ القرآن: ۶۰:۴
108۔ وہ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے جو کچھ سند نہ رکھے، ایسے کو طاغوت کہتے ہیں۔ بت اور شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں۔ (شاہ عبدالقادر، موضح القرآن: سورۃ النحل: ۳۶۔ س۔ ن)
109۔ القرآن: ۲۵۱:۲
110۔ ابن جماعة، بدرالدین، محمد بن ابراهیم (م:۱۳۳۳ھ) مختصر فی فضل الجهاد. مطبع دارالحریة للطباعة. بغداد. ۱۹۸۳ء۔ ۱۰۳
یہی قول فضیل ابن عیاض کی طرف بھی منسوب ہے۔ المصباح المضئی فی دولة المستضیئی ۱:۱۴۹
111۔ نہج البلاغۃ۔ ن: امامیہ پبلیکیشنز مطبع حیدری پریس لاہور۔ 1985ء۔ ۱:۱۶۵
112. الترمذی، ابواب الاحکام، ب: ماجاء فی الامام العادل، قال ابوعیسی هذا حدیث حسن صحیح، حدیث . 1330
113۔ القرآن 90:16
114۔ جیلانی، عبدالقادر، سید، غنیة الطالبین (ترجمہ اردو: امان اللہ خان ارمان) مطبع آفسٹ پریس دہلی نمبر ۴۔ س۔ ن۔ ۲۹۰
115۔ المسلم، الجامع الصحیح، ک: الامارۃ، ب: وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظہور الفتن وفی کل حال، حدیث نمبر 1851
116. ابوداؤد، السنن، ک: الجهاد، ب: فی القوم یسافرون یؤمرون احدهم، حدیث نمبر 2608
117. البخاری، الجامع الصحیح، ک: الایمان، ب: من سئل علما وهو مشتغل فی حدیثه فاتم الحدیث ثم اجاب السائل، حدیث نمبر 59
118. ابن تیمیه، السیاسة الشرعیه. ۹۳
119. الغزالی، ابو حامد، محمد بن محمد (م:۵۰۵ھ) الاقتصاد فی الاعتقاد (تحقیق محمد مصطفی ابوالعلاء) مکتبة الجندی، قاهره. ۱۳۹۳ھ. ۱۹۹
120۔ ملاحظہ ہو آخر الذکر آیت کا دوسرا حصہ ''وانزلنا الحدید فیه باس شدید ومنافع للناس'' (اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے لیے نفع کا سامان) القرآن، ۲۵:۵۷؛ نیز ملاحظہ ہو، ابن تیمیہ، سیاست شرعیہ۔ ۱۱۲
121۔ القرآن: ۳۳:۹
122۔ القرآن: ۵۹:۴
123. الطبری، محمد بن جریر، ابوجعفر (م: ۳۰۱ھ) جامع البیان عن تاویل آی القرآن. مکتبه مصطفی البابی الحلبی، قاهره. ط: ثالثا ۱۳۸۸ھ. ۵: ۱۴۷

www.rahimia.org

124۔ ایضاً: ۵:۱۵۰

125. القرطبی، محمد بن احمد (م: ۶۷۱ھ) الجامع لاحکام القرآن. دارالکتاب العربی للطباعة والنشر، قاهره. ۱۳۸۷ھ (راجع) ۵ : ۲۵۹

نوٹ:. حافظ عمادالدین ابن کثیر کهتے هیں: ان الایة عامة فی جمیع اولی الامر من الامراء والعلماء، ابن کثیر، عماد الدین (م: ۷۷۴ھ) تفسیر القرآن العظیم، دارالفکر العربی. ۲ :۳۰۳. س. ن

126. الاصبهانی، ابونعیم احمد بن عبدالله (م: ۴۳۰ھ) حلیة الاولیاء و طبقات الاصفیاء. مطبعة السعادة، قاهره. ط : ۱۳۹۴ھ. ۸ :۱۶۴

127۔ القرآن: ۴:۵۸

128۔ القرآن: ۲۷:۲۹

129۔ القرآن: ۷:۱۰۹، القرآن: ۲۷:۳۲، القرآن: ۴:۵۹،۸۳

130۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن. ۵:۲۶۰

131۔ الرازی فخرالدین (م:۶۰۶ھ) مفاتیح الغیب المعروف التفسیر الکبیر۔ دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔ ط: الرابعة: ۲۰۰۱ء، ۱۰: ۱۴۴؛ الماوردی، الاحکام السلطانیه۔ ۶

132۔ الشاطبی، ابراہیم بن موسیٰ، ابواسحٰق (م:۷۹۰ھ) الموافقات۔ مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ۔ مصر۔۴:۱۰۶

133۔ نفس المکان

134۔ مرغینانی، برهان الدین، علی بن ابی بکر (م:۵۹۶ھ) هدایة، باب الربا

135۔ محمد رفیع، عثمانی، درس شرح عقود رسم المفتی۔ ادارۃ المعارف۔ کراچی۔۲۰۰۰ء۔۶۲

136۔ قاضی ابویوسف، کتاب الخراج. ۵۶

137۔ عبد الرحمن بن رجب، ابوالفرج (م:۷۹۵ھ) القواعد فی الفقه الاسلامی. مکتبة الکلیات الازهریه، القاهره، مصر. ۲ :۶۸

138۔ نفس المکان

139۔ ابن القیم، الطرق الحکمیة. ۱۴

140۔ شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر. مہر محمد کتب خانہ، مرکز علم وادب، آرام باغ، کراچی۔ س۔ن۔ ۶۸

141۔ شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغه. ۱:۸۹

142۔ ایضاً: ۱:۸۶

143۔ الشاطبی، الاعتصام. ۲ :۳۷۰

144۔ الشاطبی، الموافقات. ۲ :۹۴

145۔ ابن تیمیه، الجوامع فی السیاسة. ۶۱

146۔ ایضاً: ۶۰

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ سیرت

عہدِ نبوی ﷺ میں یمن میں اشاعتِ اسلام

ایک مطالعہ

تحریر: حافظ محمد سرفراز غنی

اللہ تعالیٰ نے عرب کے جنوبی خطۂ زمین یعنی یمن کو جس طرح دنیاوی ترقی کے تمام اسباب عطا فرمائے تھے، اسی طرح عقائد کی درستی کے لیے عظیم المرتبت پیغمبر مبعوث کیے تھے۔ سیّدنا سلیمان علیہ السلام، سیّدنا صالح علیہ السلام اور سیّدنا ہود علیہ السلام کی دعوتِ توحید کا مرکز جزیرہ نمائے عرب کا یہی خطہ تھا، بلکہ سیّدنا ہود علیہ السلام کے روضۂ انور کا یمن کے شہر ''حَضَرَ مَوت'' میں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی دعوتِ توحید اور پیغامِ حق کا میدان سرزمینِ یمن ہی تھی۔ بعد میں دوسری قوموں کی طرح اہلِ یمن نے بھی تعلیماتِ خداوندی سے آہستہ آہستہ روگردانی کی اور انبیا علیہم السلام کی بتائی ہوئی تعلیماتِ صحیح کو چھوڑ کر معبودانِ باطلہ کی پوجا شروع کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں رائج شدہ مذاہب میں سے کوئی مذہب ایسا نہ ہوگا، جس کے پیروکار یمن میں نہ موجود ہوں۔

جب اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو دعوتِ اسلام عام کرنے کا حکم دیا تو آپ ؐ نے یمن کے مذہبی اور سیاسی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہاں کے باشندوں کو ایمان کی دولت سے فیض یاب کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی۔ اس مقالے میں ان بنیادی عوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو یمن میں اشاعتِ اسلام کا ذریعہ بنے۔

1۔ شاہراہیں اور تجارتی منڈیاں

وہ اسباب جن کے ذریعے اسلام کی دعوت اہلِ یمن تک پہنچی، ان میں سے ایک عربی شاہراہیں یا منڈیاں ہیں۔ یمن اپنے جغرافیائی اور اقتصادی محلِ وقوع کی وجہ سے تمام عرب کے لیے اہم ہے۔ کیوں کہ وہ اہم تجارتی شاہراہوں کے درمیان واقع تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں تجارتی قافلے دو ہی راستوں سے گزرتے تھے۔ ان کے لیے کوئی تیسرا راستہ نہ تھا:

1۔ ایک راستہ مشرقی تھا، جو عراق میں عمان کے ساتھ جا ملتا تھا۔ اسی راستے سے یمن، ہندوستان اور ایران کا تجارتی سامان اِدھر اُدھر منتقل ہوتا تھا۔ پھر یہی راستہ مغربی عراق کو بلاد الشام سے ملاتا تھا۔ اس طرح اس راستے سے شام کی منڈیوں سے گزرتے ہوئے ہندوستان جاتے تھے۔ یوں دونوں اطراف کے تُجّار اِن چیزوں کا آپس میں تبادلہ کرتے تھے، جو ایک دوسرے کے ہاں پیدا نہ ہوتی تھیں۔

2۔ دوسرا اہم ترین راستہ مغربی راستہ تھا، جو بہ قول سعید الافغانی:

www.rahimia.org

''یمن اور حجاز کے علاقوں سے گزرتا ہوا یمن کو شام سے ملاتا تھا۔ اس راستے کی بدولت یمن، حبشہ اور ہندوستان کے تجارتی سامان کو شام کی طرف منتقل کیا جاتا تھا اور شام کے تجارتی سامان کو یمن کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ پھر یہی راستہ حبشہ، مشرقی افریقا اور سمندر کے ذریعے ہندوستان کی طرف جاتا تھا۔''(1)

ان شاہراہوں کی وجہ سے یمن کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان کی بدولت جزیرہ نمائے عرب کے تاجر بھی یمن کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جزیرہ نمائے عرب میں تجارتی بازاروں یا منڈیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اگر زمانۂ قدیم یعنی قبل از اسلام کے نقشے کو بہ غور دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان منڈیوں میں سے زیادہ تر منڈیاں مذکورہ دونوں شاہراہوں پر لگتی تھیں۔

اہلِ یمن تجارت کے لیے قافلوں کی صورت میں اپنے شہروں سے ان دونوں تجارتی راستوں سے گزرتے ہوئے دوسری عربی منڈیوں کی طرف نکلتے تھے، جیسے عرفہ کے پاس ''**ذی المجاز**''، شام اور حجاز کے درمیان ''**دومة الجندل**''، مکہ اور طائف کے درمیان ''**سوقِ عُکاظ**'' جو عرب کی عظیم ترین منڈیوں میں سے ایک تھا۔

موّرخین نے درجِ بالا حجازی منڈیوں میں اہلِ یمن کے آنے کا ذکر کیا ہے، مثلاً حضرت عفیف کندیؓ کے متعلق آتا ہے کہ:

''وہ تجارت کی خاطر یمن سے مکہ مکرمہ میں آتے تھے اور وہ حضرت عباسؓ کے دوست تھے۔''(2)

اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ:

''قیس بن مکشوح مرادی (3) عکاظ کی منڈی میں آیا کرتے تھے اور وہاں بعض اشخاص کے ساتھ انھوں نے دوستی قائم کر رکھی تھی۔''(4)

درجِ بالا واقعات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کی خبر ابتدا ہی میں اہلِ یمن تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعض اَور بھی ثبوت ملتے ہیں:

1۔ حجازی بازاروں میں رسول اللہؐ کی اعلانیہ دعوت کی خبر مشہور ہوچکی تھی۔ اس کے متعلق حضرت ربیعہ بن عبادہؓ، جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، فرماتے ہیں کہ میں نے جاہلیت کے زمانے میں رسولِ اکرم ﷺ کو ''**ذوالمجاز**'' کے بازار میں دیکھا کہ آپؐ فرما رہے تھے:

''**قولو لاإلٰه إلّا اللّٰه تفلحو.**'' (5)(اے لوگو! **لاإلٰه إلّا اللّٰه** کہو، تم کامیاب ہوجاؤ گے۔)

اسی طرح ابن سعد رقم طراز ہیں:

''حضور ﷺ **عُکاظ، مجنّہ** اور **ذوالمجاز** کی منڈیوں میں لوگوں کی رہائش گاہوں پر تشریف لے جاتے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے۔''(6)

2۔ مکۃ المکرّمہ کی منڈیوں اور تجارتی بازاروں میں دعوتِ اسلام دینے کا ایک ثبوت حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کی درجِ ذیل روایت ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''میں ایک تجارتی قافلے کے ساتھ یمن کی طرف نکلا، جس میں ابوسفیان بن حرب بھی تھے۔ دورانِ سفر ابوسفیان نے مجھ سے دریافت کیا:

www.rahimia.org

اے ابوالفضل! کیا تم جانتے ہو کہ تمھارا بھتیجا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے؟

میں نے جواب دیا: میرا کون سا بھتیجا؟

ابوسفیان نے کہا: تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ تمھارے بھتیجوں میں سے ایک کے سوا کس کو یہ بات کہنی چاہیے؟

میں نے کہا: کون سا بھتیجا؟

انھوں نے کہا: محمد ﷺ بن عبداللہ۔

میں نے کہا: انھوں نے کیا فرمایا ہے؟

یہ سن کر ابوسفیان نے اپنے نام ایک خط نکالا اور کہا کہ یہ خط حنظلہ بن ابوسفیان کے نام ہے، جس میں مذکور تھا: میں تمھیں خبر دیتا ہوں کہ محمد ﷺ ابطح وادی میں کھڑے ہوئے اور کہا: ''میں تمھیں اللہ عز وجل کی طرف بلاتا ہوں۔'' یہ سن کر حضرت عباسؓ نے فرمایا: اے ابوحنظلہ! میں اسے سچا پاتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا: اے ابوالفضل! ٹھہرو، اللہ کی قسم! میں پسند نہیں کرتا کہ وہ اس طرح کی بات کہیں۔

یہ خبر جب یمن کے علمائے یہود تک پہنچی تو ایک یہودی نے ابوسفیان سے پوچھا: یہ کیسی خبر ہے؟ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں سے کوئی اس شخص کا چچا ہے، جس نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: یہ سچ ہے۔ میں اس کا چچا ہوں۔ یہودی نے پوچھا: کیا تم اس کے باپ کے بھائی ہو؟ انھوں نے فرمایا: ہاں! یہودی عالم نے ابوسفیان سے کہا: پھر مجھے ان کے بارے میں بتاؤ۔ ابوسفیان نے کہا: مجھ سے ان کے بارے میں نہ پوچھو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہمیشہ اس بات کا دعویٰ کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ ان پر عیب لگاؤں۔ (7)

اس کے بعد اس یہودی عالم نے حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کو بلایا تو انھوں نے اس سے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے میرے چچازاد سے ہمارے خاندان میں سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا ہے۔ یہ جو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور انھوں نے تمھیں بتایا ہے کہ وہی ان کے چچا ہیں، وہ ان کے چچا نہیں ہیں، بلکہ چچا کے بیٹے ہیں۔ میں ان کا چچا اور ان کے باپ کا بھائی ہوں۔ یہودی عالم نے پوچھا: ان کے باپ کا بھائی؟ میں نے کہا: ہاں! ان کے باپ کا بھائی۔ اس پر وہ ابوسفیان کی طرف متوجہ ہوا اور دریافت کیا: کیا اس نے سچ کہا؟ انھوں نے کہا: ہاں! سچ کہا ہے۔

میں نے کہا: مجھ سے پوچھو، اگر میں جھوٹ بولوں' یہ اس کی تردید کرے گا۔ چناں چہ وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہا: میں تمھیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تمھارے بھتیجے کو پاگل پن یا جنون تو نہیں ہے؟ میں نے کہا: نہیں، عبدالمطلب کے خدا کی قسم! نہ انھوں نے کبھی جھوٹ بولا اور نہ خیانت کی۔ قریش کے ہاں ان کا لقب ''امین'' ہے۔ یہودی نے پوچھا: کیا انھوں نے کبھی اپنے ہاتھ سے لکھا؟ حضرت عباسؓ کہتے ہیں: میں نے گمان کیا کہ یہ وصف آپؐ کے لیے بہتر ہے۔ اس لیے میں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کا ارادہ کیا، لیکن مجھے یاد آیا کہ ساتھ میں ابوسفیان موجود ہے، وہ مجھے جھٹلا دے گا اور میری بات کی تردید کردے گا۔ چناں چہ میں نے کہا کہ: آپؐ لکھتے نہیں ہیں۔ اس پر اس یہودی عالم نے جُھرجُھری لی، اس کی چادر گر پڑی اور وہ کہنے لگا:

www.rahimia.org

''یہودی ذبح ہوگئے، یہودی ہلاک ہوگئے۔''

حضرت عباسؓ کہتے ہیں: پھر جب ہم اپنے گھر کو لوٹے تو ابوسفیان نے کہا: اے ابوالفضل! بے شک یہودی تیرے بھتیجے سے ڈرتے ہیں۔ میں نے کہا: میں نے بھی وہی کچھ دیکھا ہے جو تم نے دیکھا ہے تو اے ابوسفیان! کیا تم ان پر ایمان لے آؤ گے؟ ابوسفیان نے جواب دیا: اس کے متعلق وقت بتائے گا کہ میں کیا کروں گا۔''(8)

بعثتِ نبویؐ کے ابتدائی زمانے میں یمن کے علمائے یہود کی مجالس میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا تذکرہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ یمن کو یہ خبر قریشی یا یمنی تاجروں کے ذریعے پہنچ چکی تھی۔ اس بات کا ایک اَور ثبوت بلاذری کی طرف سے لکھی گئی صلح حدیبیہ کی شرائط کے ذکر سے بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قریش نے صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ شرط بھی رکھی تھی کہ یمن، طائف اور شام کی طرف جانے والے تجارتی راستوں کو ہر طرح سے پُرامن رکھا جائے گا۔''(9)

اس کا مطلب یہ ہے کہ قریشی تاجروں کے نزدیک یمن اور اس کی طرف جانے والی شاہراہیں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی وَجہ سے وہ یمن جانے سے نہیں رُکتے تھے اور انھوں نے اس راستے پر مسلمانوں کے تسلط کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے یہ شرط عائد کی تھی۔ اہلِ قریش کی طرف سے صلح حدیبیہ کی شرائط طے کرتے ہوئے درجِ بالا شرط عائد کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح تجارت کی غرض سے یمن جانا قریش کی مجبوری تھی، اسی طرح اہلِ یمن بھی مکہ مکرمہ اور اس کے اردگرد منعقد ہونے والے تجارتی میلے نہیں چھوڑتے تھے۔ ان دوطرفہ روابط کی صورت میں ناممکن تھا کہ اہلِ یمن کو بعثتِ رسول ﷺ اور تعلیماتِ اسلام کی خبر نہ پہنچتی۔

2۔ حج اور عمرے کے ایام

دوسرا ذریعہ جس کی بدولت اسلام کی شعاعیں اہلِ یمن کے قلوب کو روشن کرنے لگیں، وہ حج اور عمرے کے ایام تھے۔ اہل عرب حج کے ایام میں مکہ مکرمہ میں جمع ہوتے تھے۔ اگرچہ ان کی ادائیگی حج کا وہ طریقہ نہ تھا، جو سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے بتایا تھا، مگر پھر بھی وہ اپنی مشرکانہ رسوم کے ساتھ اس کی ادائیگی کا اہتمام بڑے شوق سے کرتے تھے۔ اس کے لیے پورے عرب سے لوگ ذی الحجہ میں مکہ مکرمہ کا سفر کرتے تھے۔

حج کے ایام میں رسول اللہ ﷺ تمام عرب سے آئے ہوئے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی بھرپور کوشش کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے آپؐ ہر سال حج کے موسم میں حاجیوں کی قیام گاہوں میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جب بھی آپؐ کسی صاحبِ شرف شخص کے بارے میں سنتے کہ وہ مکہ مکرمہ میں آیا ہوا ہے تو اس کی طرف بھرپور توجہ دیتے اور اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے۔ آپؐ کے اس عمل کے متعلق حضرت ربیعہ بن عبادہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکا تھا اور منیٰ میں اپنے باپ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ عرب قبائل کی قیام گاہوں کے درمیان کھڑے ہو کر فرما رہے تھے:

''يا أيّها النّاس! إنّ اللّٰه يأمركم أن تعبدوا و لا تُشركوا به شيئاً.'' (10)

(اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔)

درجِ بالا خطبہ دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کا قصد کیا، ان میں اہلِ یمن کے کچھ قبائل کے لوگ بھی تھے، مثلاً اہلِ کندہ، بنی حارث بن کعب، عذرہ اور حضارمہ۔

حضرت حارث بن حارث غامدیؓ، جو قبیلہ مذحج کی ایک شاخ غامد سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں بیان کیا:

''میں نے اپنے باپ کے ساتھ حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ آپؐ لوگوں کو دعوتِ توحید دے رہے تھے اور قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر رہے تھے۔''(11)

حضور ﷺ کے اس دعوتی عمل کو روکنے کے لیے قریش مکہ اپنی تمام کوششیں بروئے کار لاتے تھے۔ وہ اس بات کی بھرپور کوشش کرتے تھے کہ آپؐ کی دعوت سے کوئی شخص یا قبیلہ متأثر نہ ہو۔ اس کے لیے انھوں نے باقاعدہ ایک کمیٹی بنا رکھی تھی، جس کا رُکن آپؐ کا چچا ابولہب بھی تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کرتا اور جہاں بھی آپؐ کلام کرتے یا لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے، وہ اس کی تردید کرتا۔ خاص طور سے حج وعمرے کے ایام میں آپؐ کے پیچھے لگ جاتا۔ جب بھی آپؐ حجاجِ کرام کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ وہاں پہنچ جاتا اور کہتا:

''لوگو! یہ شخص تمھیں اپنے آباؤاجداد کا دین چھوڑنے کو کہتا ہے، اس کی بات نہ مانو۔''(12)

دوسری طرف نبی کریم ﷺ کو حضرت عباسؓ اسلام کی اشاعت کے لیے یمن سے آئے ہوئے قبائل کی قیام گاہوں کی طرف لے جاتے۔ جب وہ آپؐ کو قبیلہ کندہ کی قیام گاہ پر لے گئے تو انھوں نے عرض کیا:

یا رسول اللہ! یہ کندہ کے لوگ ہیں۔ یہ یمن سے بیت اللہ کا حج کرنے کے لیے آنے والے لوگوں میں سب سے افضل ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: ''تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟''

انھوں نے کہا: یمن سے۔

آپؐ نے فرمایا: ''یمن کے کس قبیلے سے؟''

انھوں نے کہا: کندہ سے۔

فرمایا: ''کندہ کے کون سے خاندان سے؟''

انھوں نے کہا: بنی عمرو بن معاویہ سے۔

آپؐ نے فرمایا:

''گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ نماز قائم کرو اور اللہ کی طرف سے تمھارے پاس جو کلام آیا ہے، اس پر ایمان لاؤ۔''

انھوں نے عرض کیا:

اگر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو کیا آپ اپنے بعد بادشاہی ہمارے لیے چھوڑیں گے؟

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

www.rahimia.org

''بے شک بادشاہی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، وہ جسے چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے۔''(13)

نبی اکرم ﷺ کا یہ دعوتی طریقہ اتنا کام یاب ہوا کہ چند سالوں میں اہل یمن کے تمام بڑے قبائل تک آپ ؐ کا پیغام پہنچ گیا۔ حضرت عفیف کندیؓ اور حضرت مقداد بن اسودؓ اسلام لے آئے اور اپنے قبائل میں جا کر دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام کرنے لگے۔

3۔ داعیانِ اسلام کا دعوتی کردار

اہل یمن کو اسلام کی طرف راغب کرنے کا ایک بڑا ذریعہ داعیانِ اسلام کا دعوتی کردار بھی تھا۔ ان کی یمن کی طرف روانگی کی ابتدا مکی عہدِ رسالت کے ابتدائی سالوں میں ہی ہوگئی تھی۔ اس دور کے نمایاں داعیانِ اسلام میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ تھے، البتہ یمن کی طرف باقاعدہ طور پر دُعاۃ کو بھیجنے کا سلسلہ ۸ر ہجری میں حضرت علیؓ کو قبیلۂ طے کی طرف روانگی سے ہوا۔ اس کے بعد رسولِ کریم ﷺ نے حضرات معاذ بن جبل، خالد بن ولید، عمرو بن حزم، زیاد بن لبید، طاہر بن ابی ہالہ اور مہاجر بن ابی اُمیہ رضی اللہ عنہم کو یمن کی طرف روانہ فرمایا۔

ان داعیانِ اسلام کو یمن کی طرف روانہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اشاعتِ دین کے چند رہنما اصول وضوابط بتائے، مثلاً جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو بہ طورِ مبلغ یمن کی طرف روانہ فرمانے لگے تو آپ ؐ نے انھیں یہ نصیحت کی:

''یسّرا و لا تعسّرا، بشّرا و لا تنفّرا، تطاوعا و لا تختلفا.'' (13)

(لوگوں کے لیے آسانیاں فراہم کرنا، انھیں سختیوں میں مبتلا نہ کرنا۔ دیکھو! تمھیں بشارت دینے والا بن کر جانا ہے اور لوگوں کو خوش خبریاں دینی ہیں۔ ان کو اسلام سے دور نہیں کرنا ہے۔ تم دونوں آپس میں اتفاق رکھنا، اختلاف کا شکار نہ ہونا۔)

جب کوئی داعی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی ناکامی اور قبیلے والوں کی ہٹ دھرمی سے متعلق بتاتا تو آپ ؐ اس کو نئی ہدایات دے کر پھر روانہ کر دیتے۔ مثلاً حضرت طفیل بن عمر دوسیؓ کو بہ طورِ داعی اپنے قبیلے میں کوئی خاص کامیابی نہ ملی تو انھوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میری قوم کی ہلاکت کے لیے بددعا کریں، مگر آپ ؐ نے بددعا کرنے کے بجائے ان کے حق میں دعا کی: **''اللّٰھمّ اھد دوسا.''** (اے اللہ! قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔)

پھر حضرت طفیلؓ کو حکم دیا:

''إرجع إلیٰ قومک فادعھم و ارفق بھم.'' (15)

(اپنی قوم کے طرف واپس جاؤ۔ ان کو دینِ حق کی طرف بلاؤ اور ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو۔)

اسی طرح آپ ؐ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو بہ طورِ داعی یمن بھیجنے کا ارادہ کیا تو روانگی سے قبل انھیں یہ نصیحت فرمائی:

''یا معاذ! إنّی اوصیک بتقوی اللّٰہ، و صدق الحدیث، و وفاء بالعھد، و أداء الأمانة، و ترک الخیانة، و رحمة الیتیم، و حفظ الجار، و کظم الغیظ، و خفض الجناح، و بذل السّلام، و لین

الکلام، و لزوم الإیمان، و التّفقّہ بالقرآن، و حبّ الآخرۃ، و الجزع من الحساب، و قصر الأمل، و حسن العمل، و انہماک أن تشتم مسلماً، أو تصدق کاذباً، أو تکذب صادقاً، أو تعصی اماماً عدلاً.

یا معاذ! اذکر اللّٰہ عند کلّ حجر و شجر، و احدث مع کل ذنب توبۃ، السّر بالسّر، و العلانیۃ بالعلانیۃ، وعد المریض، و أسرع فی حوائج الأرامل و الضّعفاء، و جالس الفقراء و المساکین، و أنصف النّاس من نفسک، و قل الحقّ و لا تأخذک فی اللّٰہ لومۃ لائم. و لا تقضینّ و لا تفصلنّ إلاّ بما تعلم. و ان أشکل علیک أمر فقِف حتی تبیّنہ أو تکتب إلیّ فیہ. إذا قدمت علیہم فعلّمہم کتاب اللّٰہ و أدّ بہم علیٰ الأخلاق، و أنزل النّاس منازلہم من الخیر و الشّرّ، و لا تہاب فی أمر اللّٰہ و لا فی مال اللّٰہ، فإنّہ لیس لک و لا لأبیک، و علیک باللّین و الرّفق فی غیر ترک الحقّ حتّیٰ یقول الجاہل: قد ترک یعنی الحقّ، و اعتذر إلیٰ أہل عملک فی کلّ امر خشیت أن یقع فی أنفسہم علیک عتب حتّیٰ یعذروک.

و لیکن من أکبر ھمّک الصّلوٰۃ، فإنّہا رأس الإسلام بعد الإقرار بالدّین. إذا کان الشّتاء فعجّل الفجر من طلوع الفجر و أطل القرأۃ فی غیر أن تملّ النّاس، أو یکن إلیہم امر اللّٰہ، و عجّل الظّہر حین تزول الشّمس، و صلّ العصر و المغرب علیٰ میقات واحد فی الشّتاء و الصّیف. و صلّ العصر و الشّمس بیضاء، و صلّ المغرب حین تغرب الشّمس، و صلّ العتمۃ و أعتم بہا فإنّ اللّیل طویل، و إذا کان الصّیف فاسفر فی الفجر، فإنّ اللّیل قصیر و النّاس ینامون، فأمہلہم حتّیٰ یدرکوہا. و أخّر الظّہر بعد أن یتنفّس الظّلّ و یتحوّل الریح؛ فإنّ النّاس یقیلون، فأمہلہم حتی یدرکوہا. و صلّ العتمۃ و لا تعتم بہا فإنّ اللّیل قصیر. و أتبع الموعظۃ الموعظۃ، فإنّہا أقویٰ لہم علیٰ العلم بما یحبّ اللّٰہ، و ابعث فی النّاس المعلّمین، و احذر اللّٰہ الّذی ترجع إلیہ. إنّک تقدم علیٰ أہل کتاب و إنّہم سائلوک عن مفاتیح الجنّۃ، فأخبرہم أنّ مفاتیح الجنّۃ لا إلٰہ إلا اللّٰہ. تواضع للّٰہ یرفعک اللّٰہ. استدق الدّنیا تلقک الحکمۃ.

و فی روایۃ: یؤتک اللّٰہ الحکمۃ. فإنّ من تواضع للّٰہ عزّ و جلّ و استدق الدّنیا، أظہر اللّٰہ الحکمۃ من قبل علیٰ لسانہٖ. و استشر فالمستشیر معان، و المستشار مؤتمن. ثمّ اجتہد، فإنّ اللّٰہ (عزّ و جلّ) ان یعلم منک الصّدق یوفقک، و ان التّبس علیک فقف، و امسک حتّیٰ تبیّنہ، أو تکتب إلیّ فیہ. و لا تضربنّ فیما تجد فی کتاب اللّٰہ و لا فی سنّتی علیٰ قضاء إلاّ عن ملأ، و احذر الھویٰ فإنّہ قائد الأشقیاء إلیٰ النّار.'' (16)

(اے معاذ! میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی، سچ بولنے کی، وعدہ پورا کرنے کی، امانت ادا کرنے کی، خیانت نہ کرنے کی، یتیم پر رحمت کرنے کی، پڑوسی کی حفاظت کرنے کی، غصہ پینے کی، نرمی کرنے کی، اسلام

www.rahimia.org

پھیلانے کی، نرم بات کرنے کی، ایمان پر پختگی کی، قرآن مجید کو سمجھنے کی، آخرت سے محبت کرنے کی، حساب سے ڈرنے کی، آرزوؤں کو کم کرنے کی، اچھے اعمال کرنے کی۔ اور میں تمھیں منع کرتا ہوں اس سے کہ کسی مسلمان کو بُرا بھلا کہو یا کسی جھوٹے کی تصدیق کرو اور کسی سچے کو جھوٹا قرار دو یا کسی عادل امام کی نافرمانی کرو۔

اے معاذ! ہر پتھر اور درخت کے قریب اللہ کا ذکر کرو۔ ہر گناہ کے بعد توبہ کرو۔ اگر گناہ پوشیدہ ہو تو توبہ بھی خاموشی سے کرلو، لیکن اگر گناہ کا ارتکاب کھلم کھلا کیا ہو تو توبہ بھی علانیہ کرو۔ مریض کی عیادت کرو۔ کمزور اور بے حال لوگوں کی ضرورت پورا کرنے میں جلدی کرو۔ فقرا اور مساکین کے ساتھ بیٹھو۔ لوگوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو۔ حق بات کہنے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کرو۔ بغیر علم کے فیصلہ نہ کرو۔ جس بات کا علم نہ ہو، اس کا فیصلہ کرنے سے رُک جاؤ، یہاں تک کہ حق واضح ہو جائے یا اس کو مجھے لکھ کر بھیجو۔

جب کوئی تمھارے پاس آئے تو اس کو قرآن کریم کی تعلیم دو اور ان کو اَخلاق سکھاؤ۔ اچھے اور بُرے لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبے کے مطابق معاملہ کرو۔ اللہ کے معاملے میں اور اللہ کے مال میں کسی سے محبت نہ کرو، وہ مال نہ تمھارا ہے، نہ تمھارے باپ کا۔ نرمی اور شفقت کو لازم پکڑو، حق چھوڑنے کے علاوہ کہ جاہل یہ گمان کرنے لگے کہ حق کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اپنے ماتحت عملے سے ہر اس معاملے میں معذرت کرو، جس کے بارے میں تمھیں اندیشہ ہو کہ اس میں وہ تم سے ناراض ہوں گے، تاکہ وہ تمھارا عذر قبول کرلیں۔

تمام احکامِ (اسلام) میں سب سے اہم نماز ہے، جو کہ اسلام کی بنیاد ہے، اس کا اقرار کرنے کے بعد۔ سردیوں میں طلوعِ فجر کے بعد نمازِ فجر جلدی سے ادا کرو اور اس میں لمبی قرأت کرو، مگر اتنی لمبی بھی نہیں کہ لوگ اُکتا جائیں۔ اور سورج ڈھلنے کے بعد ظہر جلدی ادا کرو۔ سردی اور گرمی دونوں میں عصر ومغرب کا وقت ایک ہے۔ سورج کی سفیدی میں عصر پڑھو اور سورج غروب ہونے کے بعد مغرب پڑھو۔ عشا کی نماز تاخیر سے پڑھو، کیوں کہ سردی کی رات طویل ہوتی ہے۔ گرمیوں میں فجر دیر سے پڑھو، کیوں کہ راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور لوگ سو رہے ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو جماعت میں شامل ہونے کا موقع دو۔ اور ظہر کو مؤخر کرو، یہاں تک کہ ہوا معتدل ہو جائے، کیوں کہ لوگ اس وقت قیلولہ کر رہے ہوتے ہیں، لہٰذا اُن کو جماعت میں شامل ہونے کا موقع دو۔ عشا کی نماز گرمیوں میں جلدی پڑھو، کیوں کہ راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔

لوگوں کو مسلسل نصیحت کرتے رہو، یہ اُن کے دل میں اللہ کی مرضی کے مطابق عمل میں پختگی پیدا کرے گا۔ لوگوں میں معلّمین بھیجو۔ اللہ سے ڈرو، جس کی طرف تمھیں لوٹ کر جانا ہے۔ تم اہلِ کتاب کے پاس جاؤ گے تو وہ تم سے جنت کی چابیوں کے بارے میں پوچھیں گے۔ ان کو بتانا کہ جنت کی چابیاں ''لا إلٰہ إلَّا اللّٰہ'' ہیں۔ اللہ کے لیے تواضع اختیار کرو، وہ تمھیں بلندی عطا کرے گا۔ دنیا کو حقیر جانو، اللہ تمھیں حکمت عطا کرے گا۔ جو شخص تواضع اختیار کرے گا اور دنیا کو حقیر جانے گا، اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر حکمت جاری کردے گا۔ مشورہ کرو، اس لیے کہ جو مشورہ کرتا ہے، اس کی مدد کی جاتی ہے اور جس سے مشورہ کیا جائے، اس کو امانت دار ہونا چاہیے۔

www.ranimia.org

پھر معاملات حل کرنے میں غور و فکر کرو۔ اگر اللہ تم کو سچا جانے تو تمھیں راستے کی توفیق دے گا۔ اور اگر تم پر معاملہ گڈ مڈ ہو جائے تو توقف کرو، یہاں تک کہ وہ تم پر واضح ہو جائے یا اس کے بارے میں مجھے لکھ بھیجو۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت میں جو کچھ پاؤ، اس کے مطابق فیصلہ علانیہ کرو۔ اور خواہشِ نفس سے بچو، اس لیے کہ وہ بدبختوں کو جہنم میں لے جانے والی ہے۔)

رسول اللہ ﷺ کی اس نصیحت کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ واضح کرتا ہے کہ داعی یا مصلح کا کردار کیسا ہونا چاہیے اور اسے دورانِ دعوت کن باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ باتیں مبلغینِ اسلام کے لیے ایک منشور یا چارٹر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

درجِ بالا نصیحت کے علاوہ کتبِ حدیث و سیرت میں نبی کریم ﷺ کی اَور بھی نصیحتیں مروی ہیں، جو آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو کی تھیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ان سے فرمایا:

''إنّک ستأتی قوماً من أهل کتاب، فإذا جئتهم فادعهم إلیٰ أن یشهدوا أن لا إلٰه إلاّ اللّٰه، و أنّ محمّد ﷺ رسول اللّٰه، فإن هم أطاعوا لک بذٰلک فأخبرهم أنّ اللّٰه قد فرض علیهم خمس صلوٰة فی کل یوم و لیلة، فإن هم أطاعوا لک بذٰلک فأخبرهم أنّ اللّٰه قد فرض علیهم صدقة تؤخذ من أغنیائهم و تردّ علیٰ فقرائهم، فإن هم أطاعولک بذٰلک فإیّاک و کرائم أموالهم، و اتّق دعوة المظلوم فإنّهٗ لیس بینه و بین اللّٰه حجاب.'' (17)

(تم ایسی قوم کی طرف جا رہے ہو، جس کی اکثریت اہلِ کتاب ہے۔ تم انھیں پہلی فرصت میں اللہ کی وحدانیت اور میری رسالت کے اقرار کی طرف بلانا۔ اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو انھیں تعلیم دینا کہ اللہ نے دن اور رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ تمھاری یہ بات بھی تسلیم کر لیں تو انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو اُن کے مال داروں سے وصول کی جاتی ہے اور ان کے غریبوں پر تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ اس امر کو بھی تسلیم کر لیں تو خیال رکھنا کہ زکوٰۃ کی مد میں ان کے عمدہ مال کو وصول کرنے سے گریز کرنا۔ اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیوں کہ اس کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی رُکاوٹ نہیں ہوتی۔)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو دعوت و تبلیغ کی اہمیت بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''فواللّٰه لأن یهدی اللّٰه بک رجلاً واحداً خیر لک من أن یکون لک حمر النّعم.'' (18)

(اللہ کی قسم! اگر اللہ تمھاری وَجہ سے ایک آدمی کو ہدایت نصیب کر دے تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ قیمتی ہے۔)

ان قیمتی ہدایات اور دعوتی اصولوں کی روشنی میں حضرت معاذ بن جبلؓ نے یمن کے علاقے جند میں اپنے دعوتی کام کا آغاز کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت مختصر عرصے میں ایسی کامیابی عطا فرمائی کہ جند کے ساتھ ساتھ اِردگرد کے علاقوں میں بھی اسلام کی صدا گونجنے لگی۔

حضرت معاذ بن جبلؓ یمن ہی میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو وہاں دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا، مگر وہ

www.rahimia.org

اپنی سختی اور مجاہدانہ مزاج کی بدولت وہ کام یابی حاصل نہ کر سکے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو عطا فرمائی تھی۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد حضرت علیؓ کو یمن بھیجا۔ علامہ ابن اثیرؒ نے حضرت علیؓ کو یمن میں اہلِ ہمدان کی طرف بھیجے جانے کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بعث رسول اللّٰہ ﷺ علِیّاً إلیٰ الیمن، و قد کان أرسل قبلهٔ خالد بن الولید إلیهم یدعوهم إلیٰ الإسلام فلم یجیبوه، فأرسل علیّاً و أمرهٔ أن یعقل خالداً و من ساء من أصحابهٖ ففعل." (19)

(رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو یمن بھیجا۔ اس سے قبل آپؐ حضرت خالد بن ولیدؓ کو وہاں دعوت و تبلیغ کے لیے بھیج چکے تھے، لیکن ان لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو روانہ کرتے وقت نصیحت کی کہ وہ حضرت خالدؓ اور ان کے اصحاب کی وَجہ سے اہلِ یمن کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی اور نقصان کا تاوان ادا کریں۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔")

حضرت علیؓ اس وقت کم عمر تھے۔ انھوں نے بارگاہِ نبویؐ میں عرض کیا: یارسول اللہؐ! آپ مجھے ان لوگوں کے پاس بھیج رہے ہیں، جو عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور مجھے اچھی طرح فیصلے کا ملکہ بھی نہیں ہے۔ آپؐ نے اپنا دستِ مبارک ان کے سینے پر رکھا اور یہ دعا کی:

"اللّٰھمّ ثبّت لسانه و اهد قلبهٗ." (اے اللہ! اس کی زبان حق پر ثابت رکھ اور اس کے دل کو ہدایت دے۔)

پھر آپؐ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"یا علی! إذا جلس إلیک الخصمان فلا تقض بینهما حتّی تسمع من الآخر ما سمعت من الأوّل، فإنّک إذا فعلت ذٰلک تبیّن لک القضاء." (20)

(اے علی! جب تمھارے پاس جھگڑنے والے دونوں فریق آجائیں تو جب تک دونوں سے برابر برابر پوری بات نہ سن لو، فیصلہ نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو صحیح فیصلہ کرو گے۔)

حضرت علیؓ جب یمن روانہ ہوئے تو حضرت براء بن عازبؓ بھی ان کے ہم سفر تھے۔ وہ اس واقعے کی پوری روداد یوں بیان کرتے ہیں:

"جب ہم یمن میں داخل ہوئے اور لوگوں کو ہماری آمد کی اطلاع ہوئی تو سب حضرت علیؓ سے ملاقات کے لیے اکٹھے ہوئے۔ انھوں نے فجر کی نماز پڑھائی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو صف بندی کر کے بیٹھ گئے۔ پھر وہ ہمارے سامنے آئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھ کر سنایا۔ چناں چہ ہمدان کا پورا قبیلہ اسی دن مسلمان ہو گیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو خط لکھ کر اس کی خبر دی۔ آپؐ نے جب ان کا خط پڑھا تو فوراً سجدے میں گر گئے اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہوئے فرمایا:

"السّلام علیٰ همدان، السّلام علیٰ همدان."

(ہمدان والوں پر سلامتی نازل ہو۔ ہمدان والوں پر سلامتی نازل ہو۔)" (21)

رسول اللہ ﷺ نے ان داعیانِ اسلام کے علاوہ حضرت عمر بن حزمؓ، حضرت مہاجر بن ابی اُمیہؓ، حضرت زیاد بن لبیدؓ، حضرت طاہر بن ابی ہالہؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عکاشہ بن ثورؓ کو یمن کی طرف اشاعتِ اسلام کے لیے روانہ فرمایا۔ ان حضرات کی بدولت اہلِ یمن کو اللہ تعالیٰ نے حق کی دولت نصیب کی۔ ان مبلغینِ اسلام نے اسلام پھیلاتے وقت رسول اللہ ﷺ سے مسلسل رابطہ رکھا اور آپؐ کے بتائے گئے دعوتی اصولوں کو ملحوظ رکھا۔

4۔ رسولِ اکرم ﷺ کے دعوتی مکاتیب

یمن میں آمدِ اسلام کا چوتھا سبب رسول اللہ ﷺ کے وہ دعوتی مکاتیب ہیں، جو آپؐ نے اہلِ یمن کو لکھے تھے۔ ان مکتوبات میں آپؐ نے یمنی معاشرے کی تقسیم اس انداز میں کی تھی:

1۔ ایرانی گورنر اور ان کے ذیلی حکام، جن کو 'ابناء' کہا جاتا تھا۔
2۔ سردارانِ قبائل، جن کا اپنے علاقوں میں اقتدار اور اثر و رسوخ تھا۔
3۔ عیسائی پادری اور راہب، جو عیسائیت کے پھیل جانے کے سبب خاص امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔
4۔ مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ''ازواء' اور 'اقیال' جو اپنے قبیلوں اور علاقوں میں اثر ونفوذ رکھتے تھے۔

درجِ بالا عناصر کو مدِنظر رکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اہلِ یمن کو دعوتی مکاتیب ارسال کیے۔ ان کی بدولت ان کی اکثریت مشرّف بہ اسلام ہوئی۔

5۔ بارگاہِ نبویؐ میں یمنی وفود کی آمد

یمن میں اشاعتِ اسلام کا ایک اَور اہم سبب وہاں کے وفود کی بارگاہِ نبویؐ میں حاضری ہے۔ عہدِ رسالت میں یمن کے کونے کونے سے مختلف قبائل کے وفود آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ اسلام قبول کرنے کے لیے، کچھ دعوتِ اسلام قبول کرنے کے بعد احکامِ دین سیکھنے اور آپؐ کی زیارت و بیعت سے مشرف ہونے کے لیے اور کچھ صلح و امن کے معاہدے کرنے کے لیے۔ ان میں سے کچھ وفود ہجرتِ مدینہ سے پہلے مکہ مکرمہ آکر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ہجرت کے بعد ان کی آمد کا سلسلہ ۵ھ میں شروع ہوا، جو آپؐ کی وفات سے چار ماہ یا (دوسری روایت کے مطابق) چالیس دن قبل تک جاری رہا۔ ۹ھ میں تو اس کثرت سے وفود آئے کہ اس سال کا نام ہی 'عام الوفود' پڑ گیا۔ بارگاہِ نبویؐ میں سب سے زیادہ وفود سرزمینِ عرب کے اسی خطے سے حاضر ہوئے اور یہی وفود یمن میں اشاعتِ اسلام کا ایک اہم ذریعہ بنے۔(22)

بعض روایات سے معلوم ہتا ہے کہ مکی عہد کی ابتدا میں یمنی قبیلہ دوس کے سردار حضرت طفیل بن عمرو مکہ آئے اور رسول اللہ ﷺ سے مل کر مشرّف بہ اسلام ہوگئے۔ انھوں نے حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر قریشِ مکہ کے ظلم وستم کو دیکھا تو آپؐ سے عرض کیا: ''یا رسول اللہؐ! آپ ہجرت کرکے میرے ساتھ یمن چلیں، ہم آپ کا بھرپور دفاع کریں گے۔''(23) یہی پیش کش بنوہمدان کے ایک اَور جاں نثار صحابی حضرت قیس بن مالکؓ نے بھی کی، مگر آپؐ نے ان دونوں کی محبت بھری دعوت کو بعض وجوہ سے قبول نہیں فرمایا۔

----

www.rahimia.org

حواشی و مراجع

1۔ الافغانی، محمدسعید، اسواق العرب فی الجاهلية و الإسلام، مكتبة الهاشميه، دمشق،1356ھ، ص:16-15۔

2۔ ابن سیّد الناس، عیون الاثر فی فنون المغازی و الشّمائل و السّیر، مكتبة القدسی، قاهره، 1356ھ، ج:1،ص:110۔

3۔ ابن الاثیر کے مطابق قیس بن مکشوح مرادی قبیلۂ مُراد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، لیکن یہ بات طے ہے کہ اسود عنسی (جس نے آں حضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا) کے قتل میں انھوں نے بھی مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ان کے پہلو میں کسی موقع پر چوٹ لگ گئی تھی، جس کی وجہ سے 'مکشوح' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

ابن الاثیر، اُسد الغابه فی تمییز الصحابه، دارِ صادر، بیروت، 1968ء، ج:6،ص:252۔

4۔ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، تاریخ الرّسل و الملوک، دارالمعارف، قاهره، 1978ء، ج:2،ص:311۔

5۔ مسند احمد بن حنبل، المكتب الاسلامی، بیروت، ج:3،ص:493۔

6۔ ابن سعد، محمد بن سعد، الطبقات الكبرىٰ، دارِ صادر، بیروت، ج:1،ص:216۔

7۔ اس وقت تک ابوسفیان اسلام نہیں لائے تھے اور حالتِ کفر پر قائم تھے۔ اسی لیے حضوؐر کی نبوت کے متعلق کوئی بات کرنے سے گریز کر رہے تھے۔

8۔ ابن كثير، ابوالفداء، اسماعيل بن عمر الدمشقی، البداية و النهاية، دارالمعارف، قاهره، 1417ه، ج: 2، ص: 345.

9۔ بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، دارالكتاب، قاهره، 1963، ص: 42-41.

10۔ ابن اسحاق، محمد بن اسحاق الحميری، كتاب المبتدأ و المبعث و المغازی، دارالمعارف، رباط، 1967، ص: 215.

11۔ ابن الاثیر، عزالدين ابوالحسن علی بن محمد الجزری، اُسد الغابة فی معرفة الصحابة، دارالسعادة، القاهرة، 1357ه، ج:1، ص: 381.

12۔ ابن سيد الناس، عيون الاثر، ج: 3، ص: 140.

13۔ ابن كثير، البداية و النهاية، ج:3، ص:140.

14۔ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب فی قولهٖ تعالىٰ: و انذر عشيرتک، حديث: 355.

15۔ طبقات ابن سعد، ج: 4، ص: 178.

16۔ یحییٰ بن آدم، كتاب الخراج، دارالهلال، قاهره، 1348ه، ص:83.

17۔ صحيح بخاری، كتاب النكاح، باب اخذ الصدقة من الاغنياء ... حديث: 1496.

18۔ مسنداحمد، ج:5، ص: 245.

19۔ ابن الاثیر، عزالدين ابوالحسن علی بن محمد، الكامل فی التاريخ، دارالهلال، قاهره، 1978ء، ج:4، ص:357.

20۔ حوالہ سابق، ص:421۔

21۔ الطبقات الكبرىٰ، ج:1، ص:340.

22۔ ابن اسحاق، السيرة النبوية، ص:739.

23۔ حاکم، محمد بن ابوعبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، احیاء التراث الاسلامی، قاہرہ، 1980ء، ج:4،ص:181۔

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ قرآنیات

کثیر المذہبی معاشرے کے لیے قرآنی ہدایات

تحریر: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

(جنگِ عظیم اوّل (1914-18ء) کے بعد دنیا پر عالمی سامراجی قوتوں کا غلبہ ہوا۔ اس کے بعد قومی جمہوریتوں کی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل عمل میں آنے لگی۔ جن معاشروں میں مسلمان اقلیت میں تھے، وہاں کثیر المذہبی معاشرے کے مطابق قرآنی تعلیمات کو سمجھنے سمجھانے کی ضرورت اور اہمیت واضح ہونے لگی۔ ایسے حالات میں برِعظیم پاک و ہند کے علمائے حق نے اس صورتِ حال کا صحیح طور پر ادراک کیا اور ہندوستان میں خاص طور پر ہندو مسلم مسائل کے حل کے لیے کثیر المذہبی وطنیت کے تناظر میں رواداری اور برداشت سے متعلق قرآنی تعلیمات واضح کیں۔ چناں چہ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے پختہ کار علما اور سیاسی شعور رکھنے والے بزرگوں اور رہنماؤں نے بروقت ان مسائل کو سمجھا اور اس خطے کے لوگوں کے سامنے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان بزرگوں نے کثیر المذہبی معاشرے کے مسائل حل کرنے کے لیے ممکن حد تک بہترین تجاویز اور آرا ظاہر کیں۔ چناں چہ ان حضرات کے خطبات و مقالات اور تحریرات اس پر شاہدِ عدل ہیں۔

آج سے تقریباً سو سال پہلے ان حضرات کے اختیار کردہ مؤقف کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ''جماعت'' اور ''جمعیت'' کے رہنماؤں نے اسلام کے خطرے کی دُہائی دینا شروع کردی۔ انھوں نے قرآنی تعلیمات کا عمیق مطالعہ کیے بغیر ان حضرات کے فکر و عمل پر بے جا تنقید کی اور نازیبا الزامات لگائے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر امیر جماعتِ اسلامی صوبہ بہار اور پھر اس کے مرکزی قیّم مولانا مسعود عالم ندوی نے تمام حدیں پار کردیں۔ انھوں نے کثیر المذہبی معاشرے کے وطنی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے رومانویت کی بنیاد پر قائم متشددانہ ذہنیت کے حامل سلفی اور وہابی اسلام کی ترجمانی کی۔ اسلام کے نام پر انھوں نے جن مزعومہ خیالات اور بلند بانگ دعوؤں کا اظہار کیا تھا، آج ستر اسّی سال گزرنے کے بعد نہ تو پاکستان میں اسلام کا نظام نافذ ہوسکا اور نہ ہی ہندوستان کا مسلمان اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکا۔ آج انھی جماعتوں کے رہنماؤں کو کثیر المذہبی معاشروں کے تقاضے تسلیم کرنے پڑ رہے ہیں۔ چناں چہ ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کے اہم رُکن کا پیشِ نظر مقالہ یہ حقیقت قبول کرنے پر مجبور ہے۔ گویا جو بات اس خطے کے باشعور علمائے حق نے سو سال پہلے کہی تھی، حالات کے جبر نے اسے منوا لیا ہے۔ سچ ہے کہ: ''ہر چہ دانا کند، کند ناداں، لیک بعد از خرابیٔ بسیار'' (جو کچھ عقل مند آدمی کرتا ہے، نادان بھی وہی کچھ کرتا ہے، لیکن بہت سی خرابی کے بعد کرتا ہے) خیر! دیر آید درست آید۔ خدا جانے کہ پاکستان کے اسلام پسندوں اور یہاں کے سیاسی مذہبی رہنماوں کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کتنی دیر لگے گی، بہرحال قرآنی تعلیمات اپنی سچائی منوا کر رہیں گی۔ مدیرِ اعلیٰ)

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کے درمیان گوناگوں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ رنگ، نسل، زبان، علاقہ، تہذیب و تمدن، معاشرت، عقیدہ، مذہب، کسی معاملے میں وہ یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان سب پہلوؤں سے ان میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ان اختلافات کو نظر انداز کرنے، انھیں گوارا کرنے اور ان کے باوجود مل جل کر رہنے اور پُرامن طریقے سے زندگی گزارنے کو موجودہ دور کی اہم قدر قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ایک اصطلاح پلورلزم(PLURALISM) کی وضع کی گئی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ 'کثرتیت' یا 'تکثیریت' کیا جاتا ہے۔

ریفرنس آکسفورڈ ڈکشنری میں PLURALISM کا یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے:

The existence or toleration is society of a number of groups that belong to different races or have different political or religious beliefs

(تکثیریت سے مراد ہے کسی سماج میں ایسے متعدد گروہوں کی موجودگی اور ان کے درمیان رواداری، جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہوں، یا مختلف سیاسی تصورات یا مذہبی عقائد کے حامل ہوں۔)

برٹانیکا ریفرنس انسائیکلو پیڈیا میں اس کی تشریح یہ کی گئی ہے:

Pluralism assumes that diversity is beneficial to society and that the disparate functional of cultural groups of which society is composed - including religious, trade unions, professional organization and ethnic minorities - should be autonomous.

(تکثیریت کا مفروضہ یہ ہے کہ تنوعِ سماج کے لیے مفید ہے۔ چناں چہ سماج کے مختلف طبقات یا تہذیبی اکائیوں کو —— جن میں مذہبی گروہ، ٹریڈ یونینز، پیشہ ورانہ انجمنیں اور نسلی اقلیتیں شامل ہیں —— حق خود اختیاری حاصل ہونا چاہیے۔)

قرآن کریم پر اعتراضات کی حقیقت

قرآن کریم پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ علاحدگی پسند ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو انفرادیت پسندی سکھاتا ہے اور انھیں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہے۔ حسنِ سلوک، ہمدردی، مساوات، ربطِ باہم، تعاون و امداد اور خوش گوار انسانی تعلقات کے سلسلے میں اس نے جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں، وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہیں۔ رہے دوسرے مذاہب کے ماننے والے تو ان کے لیے اس کے پاس نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ وہ کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں۔ ان کے ساتھ کسی طرح کی ہمدردی اور خیر خواہی نہ کریں، بلکہ انھیں تنگ کرنے، نیچا دکھانے اور تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اس طرح یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تکثیری معاشرے کے لیے اسلام موزوں نہیں ہے۔ آج جب کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن گئی ہے، مختلف قوموں، گروہوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان تعامل ناگزیر ہے، ایسے میں

www.rahimia.org

قرآن کی معاشرتی تعلیمات فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی راہ میں رُکاوٹ ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتوں میں مسلمانوں کو دوسرے دھرموں (مذاہب) کے پیروکاروں سے لڑنے جھگڑنے اور جنگ و جدال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چناں چہ جب تک ان آیتوں کو قرآن سے نکالا نہیں جاتا، دیش (ملک) کے دنگوں (لڑائی جھگڑوں) کو روکا نہیں جاسکتا۔ انھی الزامات کے تحت کچھ عرصہ قبل کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا اور قرآن پر پابندی عائد کروانے کی کوشش کی گئی تھی، مگر فاضل ججوں نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خارج کردیا۔

قرآن حکیم کی انسان دوست تعلیمات

قرآنی تعلیمات کے بارے میں یہ تأثر درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے اصولی طور پر مسلم اور کافر کے درمیان فرق کیا ہے، لیکن اس فرق کا کچھ بھی اثر انسانی حقوق اور معاشرتی تعلقات پر نہیں پڑتا۔ اس نے انسان کے جو بنیادی حقوق متعین کیے ہیں، ان سے ہر شخص بہرہ ور ہوگا، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر۔ مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے قرآن نے جو ہدایات اور تعلیمات دی ہیں، ان کا اطلاق معاشرے کے تمام افراد پر ہوگا، خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر۔ ایک ایسا معاشرہ، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے بستے ہوں، ان کے افراد کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں قرآن نے واضح ہدایات اور احکام دیے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ تعلقات بغض و عداوت، نفرت و حقارت، کشیدگی اور بدگمانی پر مبنی نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی بنیاد حُسنِ سلوک، ہمدردی، تعاونِ باہمی، نصح و خیرخواہی اور حُسنِ ظن پر قائم ہوگی۔

1۔ والدین اور رشتے داروں سے تعلقات

معاشرے میں انسان کا سب سے قریبی تعلق والدین اور رشتے داروں سے ہوتا ہے۔ قرآن ان سے حُسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے اور اس معاملے میں مسلم اور کافر کی کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص نے اسلام کو دینِ حق سمجھ کر قبول کیا ہو، لیکن اس کے والدین اس سعادت سے محروم ہوں تو بھی مذاہب کا یہ اختلاف اسے ان کی خدمت کرنے، ان کی خبر رکھنے اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ یہی نہیں، بلکہ اگر اس کے والدین اس کے اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں اس سے ناراض ہوجائیں، اس پر طرح طرح سے دباؤ ڈالیں کہ وہ اسلام سے پھر جائے اور اسے اذیتیں دیں تو ایسی صورت میں یہ عمومی ہدایت ہے کہ وہ دینِ حق سے دست بردار تو نہ ہو، البتہ ردّعمل کے طور پر طیش میں آکر اپنے والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک ترک نہ کردے، بلکہ اس معاملے میں ادنیٰ سی بھی کوتاہی نہ کرے۔ چناں چہ قرآن کا واضح حکم ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ (1)

(اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کر، جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان، البتہ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔)

یہ آیت مکی دور کے اس زمانے میں نازل ہوئی تھی، جب آں حضرت ﷺ کی دعوت پر قریش کے نوجوان لبّیک کہہ رہے

تھے اور حلقہ بہ گوشِ اسلام ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے والدین، رشتہ دار اور خاندان کے لوگ انھیں اس سے روکنے اور اسلام سے پھیر کر آبائی مذہب کی طرف واپس لانے کے لیے ہر جتن کر رہے تھے اور اس میں ناکامی کی صورت میں انھیں جسمانی اذیتیں دیتے رہتے تھے۔ ممکن تھا کہ ان حالات میں وہ نوجوان بھی ردّعمل کی کیفیت کا شکار ہو جاتے اور والدین اور رشتے داروں کے خلاف ان میں انتقامی جذبہ پیدا ہو جاتا، یا کم از کم ان سے وہ بے پروا ہو جاتے، لیکن انھیں تاکید کی گئی کہ وہ ناحق میں تو ان کی بات نہ مانیں، لیکن دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ بھلے طریقے سے پیش آئیں اور اچھا سلوک کرتے رہیں۔

2۔ رشتے داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک

والدین کے بعد رشتے داروں کا درجہ ہے۔ وہ بھی اسی طرح حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ قرآن تاکید کرتا ہے کہ رشتے دار خواہ ہم مذہب ہوں یا دوسرے مذہب کے ماننے والے، ان کے حقوق ادا کیے جائیں اور ان کی خبر گیری میں کوتاہی نہ کی جائے۔ اس معاملے میں قرآن کتنا حساس ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی شریعت میں کسی شخص کے مستحقِ میراث ہونے کے لیے مسلمان ہونے کی شرط لگائی گئی ہے۔ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی دوسرے ذریعے سے بھی اسے کسی طرح کا مالی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ غیر مسلم رشتے داروں کو وصیت یا تحفے تحائف کے ذریعے اپنے مال کا کچھ حصہ دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰۗىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا[2] (کتاب اللہ کی رُو سے عام مؤمنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ اس لیے اپنے اولیا (دیگر متعلقین) کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کرسکتے ہو۔)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رشتے داروں کے حقوق عام لوگوں پر مقدم ہیں۔ سورۂ احزاب سن ۵ھ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے، ہجرتِ مدینہ کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ آیتِ بالا کے نزول کے بعد یہ طریقہ موقوف ہوگیا اور وراثت کی بنیاد رشتے داری کو قرار دیا گیا۔ آیت کے آخری ٹکڑے اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰۗىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا کا مطلب یہ ہے کہ (میراث کے مستحق) رشتے داروں کے علاوہ اپنے دوسرے متعلقین کی مالی مدد کرنا چاہو تو دیگر کسی ذریعے (مثلاً تحفے یا وصیت وغیرہ) سے ایسا کرسکتے ہو۔

محمد بن الحنفیہؒ فرماتے ہیں:

> ''اس آیت کے ذریعے غیر مسلم کے لیے وصیت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یعنی اپنے کافر رشتے دار کے ساتھ ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مشرک رشتے دار سے اگرچہ دین کا تعلق نہیں ہے، لیکن نسبی اعتبار سے وہ رشتے دار ہے۔ اس لیے اس کے حق میں وصیت کی جاسکتی ہے۔''[3]

قتادہؒ، حسنؒ اور عطاؒ فرماتے ہیں:

> ''اس آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ مسلمان اپنے کافر رشتے داروں کو اپنی زندگی میں جو چاہے، دے سکتا

www.rahmia.org

ہے اور مرتے وقت تک اس کے لیے وصیت کرسکتا ہے۔''(4)

3۔ پڑوسیوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات

رشتے داروں کے بعد انسان کا سب سے قریبی تعلق اپنے پڑوسیوں سے ہوتا ہے۔ ان کا ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ پڑوسی اچھے ہوں تو انسان اپنے اہل وعیال، گھر اور مال سے بے فکر ہوکر کاروبارِ زندگی میں مصروف ہوتا ہے۔ ان کی طرف سے اطمینان نہ ہوتو اسے کبھی ذہنی یکسوئی نہیں مل سکتی۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان ایک اچھا پڑوسی بنے۔ اس کی ذات سے اس کے پڑوسیوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ ان کے دُکھ درد میں کام آئے اور ان کے ساتھ خوش گوار تعلقات رکھے۔ قرآن کریم میں ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ(5)

(ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتے دار سے، اجنبی ہمسائے سے، پہلو کے ساتھی سے ....احسان کا معاملہ رکھو۔)

اس آیت میں تین طرح کے پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم دیا گیا ہے:

ایک الْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ (رشتے دار پڑوسی) دوسرا الْجَارِ الْجُنُبِ (اجنبی پڑوسی) اور تیسرا الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (پہلو کا ساتھی، جس سے تھوڑی دیر کا ساتھ ہوجائے)۔ بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ الْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ سے مراد مسلم پڑوسی اور الْجَارِ الْجُنُبِ سے مراد غیر مسلم پڑوسی ہے۔(6)

احادیث میں بھی پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی بہت تاکید آئی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''من كان يؤمن بالله و اليوم الآخر فليحسن إلىٰ جاره.'' (7)

(جوشخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔)

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ؐ نے ایک موقع پر صحابہ کرامؓ کی ایک مجلس میں تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

''اللہ کی قسم! وہ شخص مؤمن نہیں ہے۔'' صحابہؓ نے دریافت کیا: ''کون؟ اے اللہ کے رسول!'' فرمایا:

''الّذی لا يأمن جاره بوائقه.'' (8) (وہ شخص جس کا پڑوسی اس کے شر وفساد سے محفوظ نہ ہو۔)

مذکورہ بالا آیت اور احادیث عام ہیں۔ ان میں مسلمان ہونے کی قید نہیں ہے۔ غیر مسلم پڑوسی بھی ان میں شامل ہیں۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک کرتے تھے۔ حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تھا۔ ان کے ملازم نے ایک بکری ذبح کی تو انھوں نے فرمایا:

''اس کا گوشت تقسیم کرو تو سب سے پہلے ہمارے یہودی پڑوسی کے یہاں بھیجو۔''

ایک شخص نے کہا: کیا آپ اس یہودی کے یہاں بھیجیں گے؟ فرمایا:

''میں نے نبی ﷺ کو پڑوسی کے بارے میں اتنی تاکید کرتے ہوئے سنا ہے کہ ہمیں اندیشہ ہونے لگا کہ آپ ؐ اسے وراثت میں حق دار قرار دے دیں گے۔''(9)

4۔ سب لوگوں سے حُسنِ معاشرت

جب کچھ لوگ ایک جگہ رہتے بستے ہیں تو ان کے درمیان سماجی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں۔ باہم خوش گوار تعلقات کے لیے ضروری ہے کہ تمام افراد ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ اپنے پڑوسیوں، ملاقاتیوں اور شرکائے کار کے ساتھ اُلفت و محبت سے پیش آئیں۔ ان کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ ان کے غم کو اپنا غم سمجھیں اور ان کی ہمدردی، مواسات، دل جوئی اور غم خواری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ قرآن انسانی جذبات کا پورا لحاظ کرتا ہے۔ وہ غیر مسلموں سے انسانی روابط رکھنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ ان کی تاکید کرتا ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ [10] (اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

تکثیری معاشرے میں رہنے والے دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے تعلقات کے سلسلے میں یہ آیت بہت اہم ہے۔ اس میں دو جملے آئے ہیں:

(۱) اَنْ تَبَرُّوْهُمْ ۔ بِـرّ سے مراد حُسنِ سلوک اور صلہ رحمی کرنا۔ [11] اس میں زیادہ سے زیادہ حُسنِ سلوک کا کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ (البِرّ: التّوسُّع فِی الإحسان إلیه) [12]

(۲) تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ کے معنی بعض مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرو، جب کہ بعض دیگر مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ صلہ رحمی کے طور پر اپنے مال کا کچھ حصہ انھیں دو۔ (أن تعطوهم قسطاً من أموالکم علیٰ وجه الصّلة) [13]

بعض مفسرین اس آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں، لیکن اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت محکم یعنی غیر منسوخ ہے۔ (و قال أکثر أهل التّاویل: هی محکمة) [14]

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے:

''هٰذهِ الآیة رُخصة من اللّٰه تعالیٰ فی صلة الّذین لم یعادوا المؤمنین و لم یقاتلوهم.'' [15]

(اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اجازت دی ہے، جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں کی اور ان سے جنگ نہیں کی۔)

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''قال أهل التّأویل: هٰذهِ الآیت تدلّ علیٰ جواز البِرّ بَین المشرکین و المسلمین، و إن کانت الموالات منقطعة.'' [16] (مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان نیکی اور حُسنِ سلوک کا معاملہ جائز ہے، اگرچہ ان کے درمیان موالات (یعنی قریبی تعلق رکھنا) ممنوع ہے۔)

www.rahimia.org

5۔غریبوں کا مالی تعاون

سماج میں کچھ لوگ غریب، محتاج، بے کس اور لاچار ہوتے ہیں۔ صاحبِ حیثیت اور مال دار لوگوں کا فرض ہے کہ ان کی خبر گیری کریں۔ وقتِ ضرورت ان کے کام آئیں اور ان کا سہارا بنیں۔ قرآن اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق روا نہیں رکھتا۔ وہ غیر مسلموں پر بھی انفاق کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ساتھ ہی وہ یہ بھی صراحت سے کہتا ہے کہ غیر مسلموں پر محض اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کیا جائے۔ ان سے کسی دُنیوی منفعت کی اُمید نہ رکھی جائے اور انھیں مال کے ذریعے اسلام قبول کرنے کا لالچ نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (17)

(اے نبی! لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے، بخشتا ہے۔ اور راہِ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو، وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم راہِ خیر میں خرچ کروگے، اس کا پورا پورا اَجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔)

یہ آیت اِنفاقِ مال کے سیاق میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کی آیات میں اہلِ ایمان سے خطاب کرکے کہا گیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمھیں عطا کیا ہے، اس سے کھلے چھپے ہر طرح سے، اس کے ضرورت مند بندوں پر خرچ کرو اور شیطان کے پیدا کردہ فقر و فاقہ کے اندیشوں میں مبتلا مت ہو اور اللہ کی راہ میں اپنا اچھا مال خرچ کرو۔ اس کے لیے خراب مال چھانٹ کر مت رکھو۔''(18)

اسی سیاق میں کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ خرچ کرو، اسی میں اللہ کی خوشنودی اپنے پیش نظر رکھو۔ اس کا فائدہ تمھاری ذات کو پہنچے گا اور تمھیں بھرپور بدلہ دیا جائے گا۔ جو لوگ تمھاری امداد کے مستحق ہیں، ان کا ہدایت یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ مت سوچو کہ ان لوگوں پر اس وقت خرچ کریں گے، جب وہ اسلام لے آئیں گے۔ انھیں ہدایت پر لانا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ جس کو چاہے گا، ہدایت سے نوازے گا۔ تمھارا کام یہ ہے کہ وہ خواہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں، اگر وہ ضرورت مند ہیں اور اللہ نے تمھیں نواز رکھا ہے تو ان کی ضرورت پوری کرو۔ روایات میں آتا ہے کہ ابتدا میں صحابہ کرامؓ اپنے رشتے داروں پر، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، خرچ نہیں کرتے تھے۔ بعض صحابہؓ نے اس سلسلے میں آں حضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ جو لوگ ہمارے ہم مذہب نہیں ہیں، کیا ان کا کچھ مالی تعاون کیا جاسکتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔(19)

6۔تمام انسانوں کا اعزاز و اکرام

خوشگوار معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ سماج کے تمام افراد کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ ان کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آیا جائے اور انھیں اچھے انداز سے مخاطب کیا جائے۔ اس معاملے میں بھی قرآن نے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (20) (اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمھیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقے کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اسی طرح احترام کے ساتھ لوٹاؤ۔)

حضرت ابن عباسؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ:

''سلام کا جواب دو، خواہ سلام کرنے والا یہودی ہو یا عیسائی یا مجوسی۔''

اس کے بعد انھوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔(21)

احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کیا جاسکتا ہے۔ ان کے سلام کا جواب دیا جاسکتا ہے اور ان سے مصافحہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کا ایک ایسی مجلس سے گزر ہوا، جہاں مسلمانوں کے علاوہ یہود اور مشرکین بھی تھے۔ آپؐ وہاں پہنچے تو آپؐ نے سلام کیا۔(22)

صحابہ کرامؓ کا بھی معمول تھا کہ جس سے بھی ان کی ملاقات ہوتی، اسے سلام کرتے تھے اور اس معاملے میں کسی سے کوئی تفریق روا نہ رکھتے تھے۔ وہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ حضرت ابوامامہؓ کی راستہ چلتے ہوئے کسی سے ملاقات ہوتی تو اُسے سلام کرتے، خواہ ملنے والا مسلمان ہو یا کوئی اَور، چھوٹا ہو یا بڑا۔ ان سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ: ''ہمیں سلام عام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔''(23) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں بھی روایات میں آتا ہے کہ وہ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے، خواہ ملنے والا مسلمان ہو یا غیر مسلم۔(24)

7۔تعاونِ باہمی پر مبنی معاملات

معاشرے کے افراد کو قدم قدم پر ایک دوسرے کے تعاون، مدد اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور انھیں باہم مختلف معاملات کرنے پڑتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ان کے لیے زندگی گزارنا دشوار ہوجائے۔ جس سماج میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں، وہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں اور ایک دوسرے سے معاملات کرسکتے ہیں۔ قرآن اس معاملے میں مذاہب کے اختلاف کو رُکاوٹ نہیں بناتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے ماننے والے غیر مسلموں کے اشتراک سے کاروبار کرسکتے ہیں۔ ان سے رہن، مزارعت وغیرہ کے معاملات کرسکتے ہیں۔ بغیر کسی کراہت کے ان کی مصنوعات استعمال کرسکتے ہیں اور انھیں اپنی چیزیں فروخت کرسکتے ہیں۔ ان کے یہاں اُجرت پر کام کرسکتے ہیں اور انھیں اپنے یہاں کام پر لگا سکتے ہیں۔ غرض! ہر طرح کے تجارتی و کاروباری معاملات غیر مسلموں کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف سے اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سلسلے میں قرآن کی اصولی تعلیم یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (25) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو! معاہدوں کی پابندی کرو)

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ غیر مسلموں سے ہر طرح کے معاملات کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

''رسول اللہؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری دنوں میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن رکھ کر اس سے

اپنے گھر والوں کی ضروریات کے لیے کچھ غلہ لیا تھا۔''(26)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک مشرک، نبی ﷺ کے پاس کچھ بکریاں لے کر آیا۔ آپؐ نے اس سے ایک بکری خریدی۔''(27)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین یہود کے پاس رہنے دی، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان میں کاشت کریں گے اور انھیں پیداوار کا نصف ملے گا۔''(28)

سفرِ ہجرت کے موقع پر ایک غیر مسلم کی خدمات حاصل کی گئیں اور اللہ کے رسول ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کی رہنمائی میں مدینے کا سفر کیا تھا۔(29) حضرت خبابؓ اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:

''میں لوہار تھا۔ میں نے مکہ میں عاص بن وائل (مشہور مشرک) کا کچھ کام کیا تھا۔''(30)

امام نوویؒ ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہلِ ذمہ اور دیگر کفار سے معاملات کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان معاملات میں کوئی حرام چیز شامل نہ ہو۔''(31)

8۔ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری

تکثیریت کا بنیادی عنصر رواداری ہے۔ یعنی اپنے عقیدے و مذہب کو حق سمجھتے ہوئے اس سے اختلاف رکھنے والوں کی یہ آزادی تسلیم کرنا کہ وہ جو عقیدہ و مذہب چاہیں، اختیار کرسکیں۔ قرآن اس کا علم بردار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (32)

(دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ بے شک ہدایت گمراہی سے ممتاز ہوگئی ہے۔)

اللہ کی رضا تو اس میں ہے کہ تمام انسان سیدھے راستے پر چلیں اور اس کی معصیت سے بچیں، لیکن اس کی مشیت یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی سے اپنے لیے عقیدہ و مذہب کا انتخاب کریں۔ چناں چہ اس نے بہ جبر تمام انسانوں کو مسلمان نہیں بنایا ہے اور اپنے پیغمبر کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملے میں جبر سے کام نہ لیں۔ قرآن میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (33)

(اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مؤمن و فرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تُو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مؤمن ہوجائیں؟)

قرآن میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سامنے حق واضح کردیا ہے۔ ساتھ ہی انھیں ارادہ و اختیار کی آزادی بخشی ہے کہ وہ چاہیں تو اسے قبول کرکے دائرۂ اسلام میں آجائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر قائم رہیں:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (34)

www.rahimia.org

(ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔)

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (35) (صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے ربّ کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔)

9۔ دوسرے مذاہب کی محترم شخصیتوں کا احترام

قرآن اہلِ مذاہب سے مکالمے کا قائل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ حق واضح کیا جائے اور باطل کی تردید کی جائے اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے اپنی مذہبی تعلیمات میں جو غلط باتیں شامل کرلی ہیں، انھیں چھانٹ کر الگ کردیا جائے، لیکن وہ تاکید کرتا ہے کہ مذاکرے و مباحثے میں سنجیدگی، متانت اور شائستگی ملحوظ رکھی جائے اور ایسا لہجہ نہ اختیار کیا جائے کہ ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوں۔ اس سیاق میں اس نے ان شخصیتوں کے بارے میں، جن سے وہ عقیدت رکھتے ہیں، نازیبا کلمات منہ سے نکالنے سے منع کیا ہے۔ اس کی سخت تاکید ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (36) (اور (اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انھیں گالیاں نہ دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں بتوں کو بُرا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے کہ اگر انھیں بُرا بھلا کہا جائے گا تو ان کی پوجا کرنے والوں کی نفرت اور کفر میں اضافہ ہوگا۔ علما کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم اس اُمت کے لیے ہر زمانے میں باقی ہے۔''(37)

امام رازیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کفار کے معبودوں کے بُرا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ اس کے جواب میں وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں نازیبا کلمات کہنے لگیں۔ اس سے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اگر تمھارا مخالف جہل اور نادانی کا مظاہرہ کرے تو تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم بھی اسی طرح کی باتیں کرنے لگو۔ اس لیے کہ اس طرح باہم جھگڑے اور گالم گلوچ کی نوبت آسکتی ہے اور یہ عقل مندوں کا شیوہ نہیں ہے۔''(38)

غیر مسلموں سے 'دوستی' کی ممانعت کا صحیح مفہوم

قرآن پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ 'دوستانہ تعلقات' رکھنے سے منع کیا ہے اور انھیں 'دشمن' کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمنوں کے بارے میں بغض و نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں، ان سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا جاتا، بلکہ انھیں نقصان پہنچانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ اس اعتراض پر بہ طورِ دلیل اس طرح کی آیات پیش کی جاتی ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (39)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔)

ایسی آیات پر ان کے صحیح تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کو 'اولیاء' نہ بنائیں۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ اس کا مادہ 'ول ی' اور مصدر 'ولاء' ہے۔ ولاء کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد چیزیں اس طرح یک جا ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو، جو اُن سے مغایر ہو۔ اسی سے استعارۃً یہ لفظ قربت کے معنی میں استعمال ہونے لگا، خواہ یہ قربت جگہ کی ہو یا تعلق کی یا مذہب کی دوستی، مدد اور عقیدے کی۔ جس شخص سے مذکورہ نوعیّتوں میں سے کسی نوعیت کا تعلق ہو، اس کے لیے 'ولی' اور 'مولیٰ' دونوں الفاظ مستعمل ہیں۔ (40) ایسی آیتوں میں لفظ 'اولیاء' انتہائی قربت کے معنی میں آیا ہے۔ علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں:

"لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ" أی لا تنصرونهم، و تستنصرونهم، و تواخونهم، و تصافونهم، و تعاشرونهم معاشرة المؤمنين." (41) (اللہ تعالیٰ کے ارشاد 'کافروں کو اولیاء نہ بناؤ' کا مطلب یہ ہے کہ ان سے تمھارا معاملہ ایسا نہ ہو کہ تم (حالتِ جنگ میں) ان کی مدد کرو، ان سے مدد چاہو، ان سے بھائی چارہ اور خلوص و محبت کے تعلقات رکھو اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہو، جس طرح اہلِ ایمان باہم رہتے ہیں۔)

ان حالات کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، جن میں مسلمانوں کو 'کافروں' سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا تھا، مسلمان سخت حالات سے گزر رہے تھے۔ ان کے خلاف ان کے دشمنوں نے جنگ برپا کر رکھی تھی اور انھیں بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے کے درپے تھے۔ یہود و نصاریٰ کا رویہ بھی کھلی دشمنی پر مبنی تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک تیسرا گروہ منافقین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے، جو ظاہر میں اسلام کا دم بھرتے تھے اور انھوں نے خود کو مسلمانوں میں شامل کر رکھا تھا، لیکن حقیقت میں وہ کافروں سے ملے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو کوئی کامیابی ملتی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے اور انھیں کچھ نقصان پہنچتا تو خوشیاں مناتے تھے۔ یہ سارے لوگ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متحد تھے۔ ایسی حالت میں اپنے دشمنوں سے قریبی تعلق رکھنا مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ یہ چیز دینی حیثیت سے بھی ضرر رساں تھی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اسی لیے قرآن نے الگ الگ ہر گروہ کے بارے میں وضاحت سے مسلمانوں کو تاکید کی کہ ان سے 'ولایت' کا تعلق نہ رکھیں۔ (ملاحظہ کیجیے آیات: النساء: 144، المائدۃ: 51، النساء: 89) اس معاملے میں قرآن نے اس حد تک تاکید کی کہ جن لوگوں کے باپ اور بھائی دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور انھوں نے ایمان پر کفر کو ترجیح دی ہے، ان سے بھی قربت کا ویسا تعلق نہ رکھا جائے، جیسا کہ اہل ایمان کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مبادا ان کے واسطے سے ان کے اسرار (جنگی راز) کفار تک نہ پہنچ جائیں۔ (التوبہ: 23)

قرآن کریم کی بعض آیات میں ان اسباب کی وضاحت کر دی گئی ہے، جن کی بنا پر مسلمانوں کے علاوہ دوسروں سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ (42) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے پیش رَو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنا لیا ہے، انھیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔)

www.rahimia.org

سورت الممتحنہ میں ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ(43)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔)

اسی سورت میں آگے ہے:

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ(44) (وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے، وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو، جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اِخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں، وہی ظالم ہیں۔)

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے۔ اس کو وہ سنجیدہ نہیں لے رہے۔ دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ اللہ کے اور تمھارے دشمن ہیں اور تیسری آیت میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ محض دین کی وجہ سے تم سے جنگ کر رہے ہیں۔ تمھیں تمھارے وطن سے نکالا ہے یا اس میں مدد کی ہے۔ یہ اسباب بجا طور پر اس بات کے متقاضی تھے کہ ان سے قریبی تعلق نہ رکھا جائے۔

یہی مضمون ایک دوسری آیت میں یوں مذکور ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ(45)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے۔ تمھیں جس چیز سے نقصان پہنچے، وہی ان کی محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں، وہ اس سے شدید تر ہے۔)

اس آیت میں لفظ بِطَانَةً کے استعمال میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے بِطَانَةً کپڑے کے اندرونی حصے کو کہتے ہیں، جو جسم سے متصل ہوتا ہے۔ بہ طورِ استعارہ اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے، جسے آدمی اپنا گہرا دوست اور ہم دم و ہم راز بنا لے۔(46) اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں سے اتنا قریبی تعلق استوار نہ کرلو کہ ان پر اپنے راز منکشف کردو۔ اس لیے کہ وہ لوگ تمھارے بہی خواہ نہیں ہیں۔ تمھیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور تم سے دشمنی اور نفرت ان کے رویّے سے عیاں ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ غیرمسلموں سے صرف ایسے قریبی تعلق سے منع کیا گیا ہے، جس سے اسلامی ریاست کے سیاسی وعسکری راز دشمنوں پر منکشف ہوجائیں اور مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہوجائے اور یہ ممانعت صرف اُن لوگوں سے ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہوں یا ان کے دشمنوں کے مددگار بنے ہوئے ہوں۔ جہاں تک عام انسانی اور سماجی تعلقات رکھنے کی بات ہے، وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

www.rahimia.org

"الإحسان و الهبة مستثناة من الولاية." (47)

(غیرمسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور انھیں کچھ دینا 'ولایت' میں شامل نہیں ہے۔)

مخالفوں سے لڑنے اور انھیں قتل کرنے کے احکام کا پس منظر

قرآن پر ایک بڑا، بلکہ شاید سب سے بڑا اعتراض اس کے تصورِ جہاد پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیرمسلموں سے جنگ کریں، ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیں، ان کے لیے گھات لگائیں اور انھیں جہاں پائیں قتل کریں۔ بہ طورِ دلیل یہ آیات پیش کی جاتی ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً (48) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو اُن کافروں سے جو تمھارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں۔)

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (49)

(...تو مشرکوں کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔)

اس طرح کی آیات پیش کرکے یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ جب تک یہ آیات ہیں، اس وقت تک مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان بقائے باہم ممکن نہیں۔

یہ غلط فہمی درحقیقت جنگ کے بارے میں قرآن کے احکام وتعلیمات کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے اور متعلقہ آیات کو ان کے سیاق وسباق سے ہٹاکر پڑھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس موضوع پر متعدد پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

(الف) جب مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا جانے لگا، تب انھیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا جواب دے سکتے ہیں:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (50) (اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ: ہمارا ربّ اللہ ہے۔)

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جنگ کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ جنگ ان پر تھوپی گئی تھی۔ دشمنوں کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو، جو ابھی کمزور ہیں، ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیں اور شمعِ اسلام کو اپنی پھونکوں سے گل کردیں۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان کا منہ توڑ جواب دیں اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں، لیکن اس وقت بھی انھیں تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ جتنی زیادتی کی گئی ہے، اتنا ہی بدلہ لیں، حد سے تجاوز نہ کریں:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (51) (اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

(ب) قرآن کریم میں مذکور آیاتِ قتال کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دورانِ جنگ کے سلسلے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ جب کسی گروہ سے جنگ برپا ہوتو میدانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں برتتا، بلکہ

www.rahimia.org

ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مخالف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے اور اس کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل کر کے اس کی فوجی طاقت پارہ پارہ کردے۔ اس موقع پر کسی کمزوری اور نرمی کا مظاہرہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مثل ہے۔

(ج) جنگ ایک ناپسندیدہ، لیکن ناگزیر صورتِ حال ہے۔ اسی لیے مختلف مذاہب میں اس کے بارے میں احکام پائے جاتے ہیں۔ جن مذاہب میں جنگ سے متعلق کسی طرح کی تعلیم نہیں ملتی، ان کی پیروؤں کو بھی مختلف مواقع پر جنگ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ مذہبی کتابوں میں جنگ سے متعلق احکام وقوانین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا تعلق دشمن قوم کے ساتھ عام برتاؤ سے ہے، بلکہ ظاہر ہے کہ ان میں جنگ کی مخصوص صوتِ حال کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں ہندومت کی مذہبی کتابوں کے چند حوالے دیے جاتے ہیں:

''اے اِندر، ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ، جو مالِ غنیمت حاصل کرتی ہے۔ نیز تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں، چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم ہر دشمن پر فتح مند ہوں۔ اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوش حال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ۔''(52)

''اے اگنی! ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، دشمنوں کو بھگا دے۔ اے اجیت! دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پجاری کو عظمت وشوکت نصیب کر۔''(53)

''اے مینو! طاقت ور سے زیادہ طاقت ور ہو کر ادھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کردے۔ دشمنوں اور ورتیروں اور دسیوں کو قتل کرنے والے! تُو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا۔''(54)

بھاگوت گیتا کا تو موضوع ہی جنگ ہے۔ یہ دراصل کرشن جی کے اس طویل اپدیشن پر مشتمل ہے، جو انھوں نے پانڈوؤں کے سردار ارجن کو جنگ پر اُبھارنے اور لڑنے کی ترغیب کے لیے دیا تھا۔

(د) ایک چیز یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان آیات کا خطاب اسلامی ریاست اور اس کی فوج سے ہے۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کو کھلی چھوٹ نہیں دے دی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں، غیر مسلموں کو قتل کردیں، بلکہ اسلامی ریاست سے دشمنی رکھنے والے غیر مسلموں سے جنگ کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف سربراہِ ریاست کو ہے۔ اسی کو طے کرنا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہیں؟ اور کی جائے تو کب اور کیسے؟ رعایا پر ہر حال میں اس کی اطاعت لازم ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ نے لکھا ہے:

''أمر الجهاد موكول إلىٰ الإمام و اجتهاده، و يلزم الرّعيّة طاعته فيما يراه من ذٰلک.''(55)

(جہاد کا معاملہ سربراہِ ریاست کے ذمے ہے۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گا اور رعایا پر اس کے فیصلے کو تسلیم کرنا لازمی ہے۔)

جن آیات میں 'کفار ومشرکین' سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اگر ان کا مطالعہ ان کے سیاق میں کیا جائے اور حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے، جن میں وہ نازل ہوئی تھیں تو کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا، بلکہ پڑھنے والے پر ان کی معقولیت آشکارا ہوگی۔

--------- ------

www.rahimia.org

(نوٹ: شعبۂ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونی ورسٹی، کلکتہ اور اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اشتراک سے مؤرخہ 13، 15/ مارچ 2015ء میں سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار 'تکثیری معاشرہ، اسلام اور مسلمان' کے مرکزی موضوع پر منعقد ہوا تھا۔ اس کے لیے راقم نے یہ مقالہ تحریر کیا تھا، لیکن بعض ناگزیر وجوہ سے اس سیمینار میں شرکت نہیں ہوسکی۔ اس موضوع کے بعض پہلوؤں پر راقم کی کتاب 'حقائق اسلام - اعتراضات کا جائزہ' میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ صدرِ ادارہ مولانا سیّد جلال الدین عمری کی قابل قدر کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور اُن کے حقوق' اس موضوع پر بھرپور اور جامع مطالعہ ہے۔ موصوف کی دوسری کتاب 'غیر اسلامی ریاست اور مسلمان' میں بھی دورِ حاضر کے پس منظر میں اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رضی الاسلام)

(ماخوذ از سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی'' علی گڑھ، اپریل تا جون 2015ء)

--------- ------

حواشی ومراجع

1۔ القُرآن: 15:31۔ 2۔ القُرآن: 6:33۔

3۔ قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، الهيئة المصرية العامّة، 1987ء، 126/14۔

4۔ ایضاً۔ 5۔ القُرآن: 36:4۔

6۔ ایضاً، 183/5۔ علامہ قرطبیؒ نے ان کا نام نوف الشامی بتایا ہے۔

7۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من کان یؤمن باللّٰہ و الیوم الآخر فلا یؤذ جاره۔ صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الحثّ علیٰ إکرام الجارّ۔

8۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب إثم من لایأمن جاره بوائقه۔ صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب تحریم إیذاء الجارّ۔

9۔ بخاری، الادب المفرد، 22/1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی حقّ الجوار۔

10۔ القُرآن: 8:60۔

11۔ ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین إسماعیل، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر)، المکتبة التجارية الکبریٰ مصر، 1356ھ، 349/4۔ لسان العرب، 54/4، ماده 'بر'۔

12۔ راغب الاصفهانی، المفردات فی غریب القرآن، المطبعة المیمنية مصر، 1324ھ، ص93۔

13۔ ابن العربی، ابوبکر محمّد بن عبداللّٰہ المالکی الإشبیلی، أحکام القرآن، مطبعة السعادة مصر، 1331ھ، 249/2۔ الماوردی، ابوالحسن علی بن حبیب البصری، النکت و العیون، (تفسیر الماوردی)، مطابع المقهوی الکویت، 1402ھ، 223/4۔ تفسیر قرطبی، 59/18۔ رازی، فخرالدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)، المطبعة العامرة مصر، 1308ھ، 134/8۔

14۔ تفسیر قرطبی، 59/18۔ 15۔ حوالہ سابق۔

16۔ تفسیر کبیر، 134/8۔ 17۔ القُرآن: 272:2۔

18۔ القرآن 2:68-267

www.rahimia.org

19۔ ابو جعفر محمد بن جریر الطبریؒ، جامع البیان عن تأویل آیۃ القرآن (تفسیر الطبری)، دارالمعارف مصر، 1969ء، 588/5۔ تفسیر کبیر 365/2۔
20۔ القُرآن: 86:4۔
21۔ بخاری، الادب المفرد، باب کیف الرّدّ علیٰ أھل الذمۃ، 533/2۔
22۔ صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب التّسلیم فی مجلس فیہ أخلاط من المسلمین و المشرکین۔ صحیح مسلم، کتاب الجھاد، باب ما لقی النبی ﷺ... الخ۔
22۔ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دارالمعرفۃ بیروت، 41/11۔
24۔ عبدالرزاق، المصنّف، کتاب أھل الکتاب، باب السّلام علیٰ أھل الکتاب۔
25۔ القُرآن: 1:5۔
26۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب شراء النّبیّ ﷺ بالنسیئۃ ودیگر ابواب۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الرّھن و جوازہ فی الحضر کالسّفر۔
27۔ ایضاً، باب الشّراء و البیع مع المشرکین و أھل الحرب۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، باب إکرام الضّیف۔
28۔ ایضاً، کتاب المزارعۃ، باب المزارعۃ مع الیھود ودیگر ابواب۔ صحیح مسلم، کتاب المساقات، باب المساقات و المعاملۃ بجزء من الثّمر و الزّرع۔
29۔ صحیح بخاری، کتاب الإجارۃ، باب استئجار المشرکین عند الضّرورۃ۔
30۔ صحیح بخاری، کتاب الإجارۃ، باب ھل یواجر الرّجل نفسہ من مشرک فی دار الحرب۔
31۔ نووی، شرح صحیح مسلم، کتاب المساقات، باب الرّھن۔
32۔ القُرآن: 256:2۔ 33۔ القُرآن: 99:10۔ 34۔ القُرآن: 3:76۔
35۔ القُرآن: 29:18۔ 36۔ القُرآن: 108:6۔ 37۔ تفسیر قرطبی۔
38۔ تفسیر کبیر۔ 39۔ القُرآن: 144:4۔ 40۔ المفردات فی غریب القرآن، 555۔
41۔ ابوالقاسم جار اللّٰہ محمود بن عمر الزمخشری، الکشّاف عن حقائق التنزیل، مصطفیٰ البابی الحبلی و اولادہ مصر، 1973ء، 619/1۔
42۔ القُرآن: 157:5۔ 43۔ القُرآن: 1:60۔ 44۔ القُرآن: 9:60۔
45۔ القُرآن: 118:3۔ 46۔ تفسیر طبری، 138/7۔ کشّاف، 458/1۔ تفسیر قرطبی، 178/4۔
47۔ تفسیر قرطبی، 94/8۔ 48۔ القُرآن: 123:9۔ 49۔ القُرآن: 5:9۔
50۔ القُرآن: 22:40-39۔ 51۔ القُرآن: 190:2۔ 52۔ رگ وید، 13-8:1:6۔
53۔ یجروید، 37:9۔ 54۔ اتھروید، 3-1:32:4۔
55۔ ابن قدامۃ، ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد المقدّسی، المغنی علیٰ مختصر الخرقی، مکتبۃ الرّیاض الحدیثۃ ریاض، 1981ء، 352/8۔

☆

عدل و انصاف کی حکومت کا مقصد

’’حکومت عادلہ اس مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہے تا کہ وہ قوم کے سیاسی، سماجی و معاشی اور ملی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنی کوشش صرف کرے۔ جس کی مختصر وضاحت یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت عادلہ سماجی معاملات میں ایسی قانون سازی کرے جس میں لوگوں کے باہمی معاملات خواہ فرد کے فرد سے ہوں یا فرد کے جماعت سے یا جماعت کے جماعت سے ہوں۔ اسی طرح اس میں عائلی زندگی کے جملہ مسائل شامل ہیں تو امام عادل ان اُمور اور حقوق کو قانونی تحفظ دے کر جزا و سزا کے لیے عدالتی نظام کو وضع کرے۔ اسی طرح قومی اداروں (مقنّنہ، انتظامیہ، عدلیہ) کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے مضبوط سیاسی نظام تشکیل دے اور لوگوں کی ضروریات زندگی کی کفالت اور تکمیل کے لیے باہمی رضامندی اور عدل پر مبنی اصول تجارت طے کرے اور ہر قسم کے ظلم و استحصال کا سد باب کرے۔ حرام معیشت، رشوت، سود اور ناجائز منافع خوری جیسے رجحانات کا خاتمہ کرے اس کے ساتھ ساتھ قوم کے دینی اور مذہبی رجحانات کا مکمل خیال رکھے۔ شعائر اسلام اور دیگر دینی تقاضوں کا خیال رکھ کر قوم کو بے دینی کے حملوں اور دشمن کی دست برد سے بچانے کا اہتمام کرے اور دین و ملت کی شان و شوکت پیدا کرے۔ اساسی اور بنیادی نوعیت کے شعبوں میں قانون سازی کرنے کے بعد اس کے نفاذ کو ہر ممکن یقینی بنائے تا کہ قوم کو حسنة فی الدّنیا (دُنیوی کامیابی) اور حسنة فی الآخرة (اُخروی نجات) کو یقینی بنانے کا پورا موقع اور سہولت میسر آ سکے۔ حقیقت میں یہی امامت عدل کے قیام کا مفہوم، مقصود اور منتہائے نظر ہے اور اسلام اللہ پر ایمان رکھنے والوں سے اسی جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے تا کہ مخلوق خدا اَمن و آشتی اور خوش حالی کی زندگی گزارے۔ وہ کسی کی محتاج، غلام اور کسی سے خوف زدہ نہ ہو تا کہ قرب خداوندی کی جملہ انواع کو اَمن و سکون اور رغبت کے ساتھ اختیار کر سکے۔ اس لیے کہ ظلم و زیادتی، خوف و ہراس اور معاشی بدحالی کے ماحول میں انسان کے جسم و روح دونوں پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔‘‘

(اسلام میں سیاست اور ریاست کا تصور، ص 81)

www.rahimia.org

QUARTERLY
Shauor o Aaghi

October - December, 2018 Vol. 10 Issue, 4 Regd.370-S

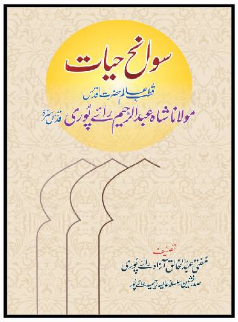

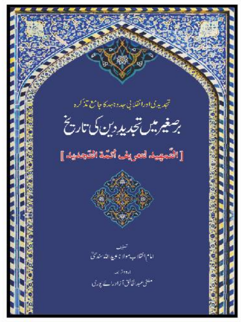

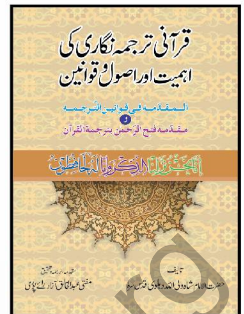

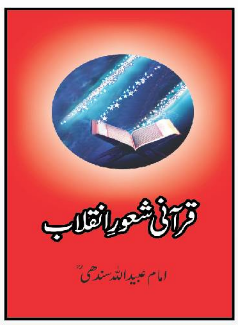

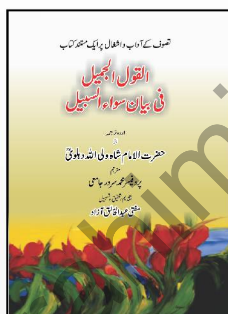

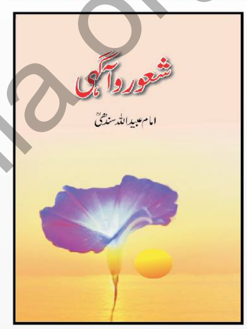

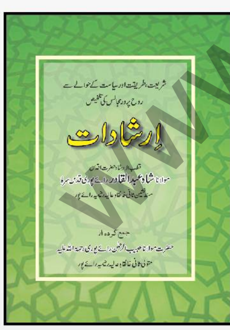

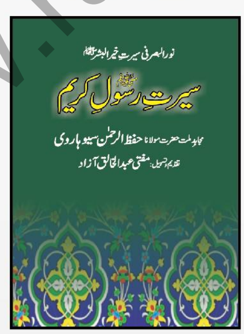

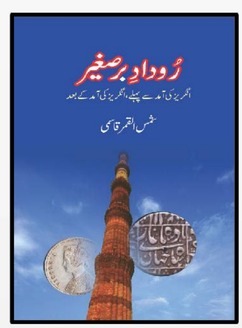

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org
info@rahimia.org /rahimiainstitute

www.rahimia.org